ترتیب

مولانا مودودی: مصلح اور داعی انقلاب

مولانا مودودی کے ناقدین کی اقسام

❖❖❖

سخن ہائے گفتنی دارد

یوں تو غیر منقسم ہندستان میں برپا کی جانے والی تحریک اسلامی کے داعی سید ابوالاعلیٰ مودودی[۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء-۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء] پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ان کی شخصیت اور افکار پر کافی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں،لیکن جب کسی عالمی شخصیت پر کوئی عالمی شخصیت قلم اُٹھاتی ہے،تو اس کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

مولانا مودودی بلاشبہہ اپنے دور کی ایک عالمی شخصیت تھے، پوری مسلم دُنیا انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔سعودی حکومت نے شاہ فیصل کی یادگار کے طور پر جب فیصل ایوارڈ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو ساری دُنیا کے مسلم علماء اور مسلم اسکالرز کے اتفاق رائے سے سب سے پہلے فیصل ایوارڈ کو مولانا مودودی کی ہی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔

اسی طرح ڈاکٹر یوسف القرضاوی بلاشبہہ اپنے وقت کی عالمی شخصیت ہیں۔ وہ تحریک الاخوان المسلمون کے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔اس وقت وہ علماء اسلام کی عالمی یونین (الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین) کے صدر ہیں۔ ان کی گراں قدر علمی تصانیف ساری دُنیا میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔

ادھر کچھ دنوں پہلے نظرات فی فکر الامام المودودی کے نام سے ان کی تصنیف منظرعام پر آئی ہے، جو گرچہ نہایت مختصر ہے،مگر راقم الحروف کے خیال میں مولانا مودودی پر لکھی گئی کتابوں میں بہت اہم اور زوردار کتاب ہے۔

یہ کتاب ''قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' کا بہترین مصداق ہے۔ علامہ قرضاوی نے بجاطور پر پوری فراخ دلی سے مولانا مودودی کی عظمتوں کا اعتراف کیا ہے، یہ خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی کے علم و فضل کو اہل علم و فضل ہی پہچانتے ہیں، کسی کی بلندیوں کی پیمائش بلندیوں پر رہنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

ہندو پاک کے علماء اس گوہر یگانہ کو اس طرح نہیں پہچان سکے، جس طرح وادیٔ نیل کے گوہر شناس دیدہ وروں نے پہچانا۔

امام حسن البنا شہید کے ساتھیوں سے براہ راست ہماری ملاقاتیں رہیں۔ اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ امام حسن البنا شہیدؒ ہمیں مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے:

یوں سمجھو گویا یہ ہماری ہی کتابیں ہیں!

امام سید قطب شہید اپنی بے مثال تفسیر فی ظلال القرآن میں جگہ جگہ مولانا مودودی کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں، اور انھیں وہ خطاب دیتے ہیں، جس سے زیادہ بلند اور عظیم خطاب ایک مومن کے نزدیک کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ وہ جگہ جگہ انھیں المُسلم العظیم یعنی 'عظیم مسلم' کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔

علامہ قرضاوی بھی انھیں ایک عظیم مصلح، ایک عظیم مفکر اور ایک بلند پایہ مجدد کہتے ہیں، اور 'الامام المودودی' کہہ کر امت کے ائمہ عظام کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

یہاں کسی کو ہرگز ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ عقیدت کی زبان ہے، یہ سارے لوگ جن کا تذکرہ کیا گیا، یہ سب انتہائی حقیقت پسند اور دیدہ ور لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ کے خوگر رہے ہیں۔

چنانچہ علامہ یوسف قرضاوی جہاں مولانا مودودی کے علم و فضل، ان کے فہم و ذکا، ان کی بصیرت و عزیمت، ان کی عبقریت اور بلند نگاہی اور غلبۂ اسلام کے لیے ان کی بے قراری کا

اعتراف کرتے ہیں، وہیں چند اُمور میں ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں، اور بغیر کسی رورعایت کے ان پر نقد کرتے ہیں۔

علامہ یوسف قرضاوی نے مولانا مودودی پر جو نقد کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اُنھوں نے مولانا مودودی کی جو تعریف و تحسین کی ہے، وہ عقیدت کی بنیاد پر نہیں کی، بلکہ اُنھوں نے ان کی کتابوں کا تحقیقی اور معروضی مطالعہ کیا ہے، جو چیزیں قابل تعریف ملیں، اِن کی تعریف کی ہے، اور جو باتیں انھیں قابل تنقید نظر آئیں، اِن پر نقد کیا ہے۔

یہاں مولانا مودودی پر تنقید کی بات آگئی ہے، تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان تنقیدی آثار کا مختصر جائزہ لے لیا جائے، جو علامہ یوسف قرضاوی نے مولانا مودودی پر کی ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم نے ایک ایک کر کے ان ساری تنقیدوں پر غور کیا، ان کی طرف سے جو جو مسائل اٹھائے گئے ہیں، ان سب کا جائزہ لیا تو ہمیں ان سارے امور میں مولانا مودودی کا موقف ہی زیادہ مضبوط و محکم اور کتاب وسنت سے قریب تر معلوم ہوا۔

مثال کے طور پر مولانا مودودی اپنی معرکہ آرا کتاب 'پردہ' میں عورت کے لیے چہرے کا پردہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن علامہ یوسف القرضاوی اسے مذہبی تشدد اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک ردّعمل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ چہرے کا پردہ واضح طور سے قرآن پاک سے ثابت ہے۔

سورہ احزاب میں اہل ایمان کو امہات المومنین کے سامنے جانے سے منع کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ط ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ (الاحزاب ۳۳:۵۳) تمھیں ان سے (یعنی امہات المومنین سے) کوئی چیز یا کوئی سامان مانگنا ہو، تو آڑ سے یا پردے کے پیچھے سے مانگو، تمھارے دلوں کی پاکی اسی میں ہے، اور ان کے دلوں کی پاکی بھی اسی میں ہے۔

اس آیت کریمہ میں واضح طور سے نامحرم اہل ایمان کو امہات المومنین کے گھروں میں داخل ہونے، اور آمنے سامنے ہوکر گفتگو کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعت آئی تو ہے امہات المومنین کے سیاق میں، لیکن یہ امہات المومنین کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

تمام نامحرم مردوں کا نامحرم عورتوں کے تعلق سے یہی حکم ہوگا۔ اہل فکر ونظر کے ہاں یہ ایک مسلمہ اصول ہے، کہ کسی شخص یا کسی گروہ کو کوئی حکم دیا جائے، اور اس حکم کی علت وحکمت بھی بیان کردی جائے، تو ایسی صورت میں وہ حکم اس شخص یا گروہ کے لیے خاص نہیں رہ جاتا، بلکہ جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی، وہ حکم لاگو ہوگا۔ اس حکم کی علت وحکمت یہ بتائی گئی ہے کہ اسی میں قلب کی طہارت ہے، چاہے وہ امہات المومنین ہوں، یا گروہ مومنین ہو۔ ظاہر ہے اگر اس حکم کا تعلق طہارت قلب سے ہے، تو یہ تمام انسانوں کی ضرورت ہے، خواہ وہ عورتیں ہوں، یا مرد ہوں، اور خواہ وہ اُس دور کے لوگ ہوں، یا اِس دور کے لوگ۔

یہ ایک نہایت واضح دلیل ہے چہرے کے پردے کی، اس کے علاوہ بھی قرآن پاک میں اس کی متعدد دلیلیں موجود ہیں، لیکن ظاہر ہے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔

علامہ یوسف قرضاوی کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ، مولانا مودودی نے جمہوریت کے سلسلے میں بھی 'تشدد' کا رویہ اختیار کیا ہے، اس پر زبردست تنقید کی، اور اسے حاکمیت الٰہ کے مقابلے میں حاکمیت جمہور کہہ کر ٹھکرا دیا۔ حالانکہ اس سلسلے میں نرم موقف اختیار کرنا چاہیے تھا، اس میں جو خوبیاں ہیں، ان کو تسلیم کرنا چاہیے تھا'۔

علامہ قرضاوی کا خیال ہے کہ جمہوریت کا حاکمیت الٰہ سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ جمہوریت دراصل کسی ایک فرد یا ایک فیملی کی حکومت کے مقابلے میں عوام کی حکومت کا اعلان ہے۔ جمہوریت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عوام کو آزادی حاصل ہوتی ہے، اور ان کے حقوق کا تحفظ ہوتا ہے، جبکہ بادشاہت میں یہ دونوں چیزیں ناپید ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں تک شریعت کی بالادستی کا تعلق ہے، تو یہ چیز تو باقی رہے گی ہی، مسلم معاشرے میں جو ڈیموکریسی ہوگی، وہ تو شریعت کی پابند اور حاکمیت الٰہ کی حامی ہوگی ہی۔

راقم کے خیال میں ضرورت ہے کہ علامہ القرضاوی اپنی اس رائے پر نظر ثانی کریں۔

یہ صحیح ہے کہ جمہوریت شخصی بادشاہت کے بجائے عوامی حکومت کا اعلان ہے، لیکن اس کی جو روح ہے، وہ حاکمیت الٰہ نہیں، حاکمیت جمہور ہے۔ یعنی قانون اور نظام اللہ کا بنایا ہوا نہیں، بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا چلے گا۔ ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اسے حاکمیت جمہور کہنا بھی صحیح نہیں۔ جمہوری حکومتوں میں جمہور (people) کا رول تو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ انتخابات کے موقعے پر کسی پارٹی کو اپنا ووٹ دے دیں، اور جب جمہور کے ووٹ سے کوئی پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے، تو پھر جمہور کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں، اور حاکم و مقتدر پارٹی ہی ملک کے سیاہ و سپید کی مالک بن جاتی ہے۔

اس کے بعد جمہور کو حکومت سے اگر کوئی بات منوانی ہو تو انھیں بھوک ہڑتالیں کرنی پڑتی ہیں، دھرنے دینے پڑتے ہیں، ریلیاں نکالنی پڑتی ہیں، اور بسا اوقات بے رحم پولیس کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں۔ اس طرح کتنی ہی جانیں ہلاک ہوجاتی ہیں، کتنے ہی جسم لہولہان ہوجاتے ہیں اور کتنے ہی خاندان تباہ ہوجاتے ہیں۔

جہاں تک عوام کو آزادی حاصل ہونے یا حقوق ملنے کی بات ہے، تو یہ بھی اک دھوکا اور جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ جمہوری ملکوں میں کس کو آزادی حاصل ہوتی ہے؟ اور کس کو حقوق ملتے ہیں؟ علامہ محمد اقبال نے کتنی صحیح بات کہی ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

آج انھی جمہوری ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں ہزاروں، لاکھوں انسان اپنے بنیادی حقوق

سے محروم رہتے ہیں۔ اور فقر و فاقہ، خوف و ہراس اور بدامنی و بے اطمینانی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی نظام اور اس کی برکتوں سے ناواقف ہیں، وہ لوگ تو جمہوریت کے جھوٹے وعدوں اور پرفریب نعروں سے دھوکا کھا سکتے ہیں، اور کھاتے ہیں۔ مگر جو لوگ اسلامی نظام کی برکتوں سے واقف ہیں، ان کے لیے ایسی بے رحم جمہوریت میں کیا کشش ہو سکتی ہے؟

خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب خلافت سنبھالی تو اپنے پہلے ہی خطبے میں یہ اعلان کیا کہ:

> لوگو! تمھیں اپنے حقوق کے لیے ہم سے کوئی کشمکش نہیں کرنی پڑے گی، بس ہمیں یہ اطلاع ہو جائے کہ کس کے کیا حقوق ہیں، ان شاء اللہ ہر ایک کے حقوق اس کے گھر پہنچ جائیں گے۔

یہ ہے اسلامی نظام جو ہر ایک کو آزادی بھی دیتا ہے، عزت بھی دیتا ہے، اور بغیر کسی ریلی اور دھرنے کے ہر ایک کے حقوق اس کے گھر پہنچاتا ہے۔

کیا جمہوریت کی پوری تاریخ میں آج تک کسی حکمراں نے اس طرح کا اعلان کیا ہے؟ یا عملاً ایسا کر کے دکھایا ہے؟

صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اسلامی نظام کی یہ شان ہے کہ اس نے ہر غریب مظلوم کے آنسو پونچھے، ہر ضرورت مند کی ضرورتیں پوری کیں، ہر مصیبت زدہ کی غم خواری کی، اور ہر شہری کو آزادی اور عزت کی قبا پہنائی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، مگر آج اس حقیقت کو کون تسلیم کرے گا؟ یہ اُمت مسلمہ کی بدنصیبی ہے کہ آج اس کے سروں پر ایسے ہی حکمراں مسلط ہیں، اور ماضی بعید سے ہوتے آرہے ہیں، جنھیں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ فرزندان اسلام کا خون پیا ہے، اور خون مسلم ہی ان کی مرغوب ترین غذا رہی ہے!

اس حکمرانی سے انھوں نے اسلام کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ بڑی تاریک اور انتہائی بھیانک ہے۔ ورنہ ان حکمرانوں نے اگر اسلام کو سینے سے لگایا ہوتا، اس کی صحیح نمائندگی کی ہوتی، اور دُنیا کو اس کی برکتوں کا مشاہدہ کرایا ہوتا، تو آج دُنیا کیوں تاریکیوں میں بھٹکتی؟ اور خدا کے بھیجے ہوئے نظام خیر و برکت کو چھوڑ کر کیوں مفاد پرست انسانوں کے بنائے ہوئے ظالمانہ نظاموں کے تلخ تجربے کرتی؟

دُنیا کو یہ جاننا چاہیے کہ آج نام نہاد مسلمان حکمرانوں کی حکمرانی کا جو رنگ وہ دیکھ رہے ہیں، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان حکمرانوں کی اپنی تصویریں ہیں، جن میں اسلام کی کوئی جھلک نہیں، اسلام ان سے ناخوش و بے زار ہے! اور مکمل طور سے ان سے اعلان براءت کرتا ہے!

الغرض جمہوریت یا جمہوری نظام پر اگر مولانا مودودی نے کڑی کڑی تنقیدیں کیں، تو یہ ان کی غلطی نہیں تھی، بلکہ یہ ان کی بصیرت اور عزیمت تھی، یہ ان کی شدت پسندی نہیں بلکہ حقیقت پسندی تھی۔ مولانا مودودی جیسے دیدہ ور عالم اور قائد تحریک سے اسی کی توقع کی جاسکتی تھی، جو اُنھوں نے کیا اور کہا۔

جمہوریت کی حیثیت زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسے دوسرے انسانی ازموں اور باطل نظاموں کے مقابلے میں قدرے غنیمت قرار دیا جائے۔ اور أهون البليتين کے اصول پر کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے اس سے چھوٹی مصیبت پر طبیعت کو راضی کر لیا جائے۔

اگر مولانا مودودی نے پاکستان کی انتخابی سیاست میں حصہ لیا، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آخر میں ان کا نظریہ بدل گیا تھا، اور مجرد جمہوریت سے انھیں کوئی خوش گمانی ہوگئی تھی۔ بلکہ یہ دراصل غلبۂ اسلام کے لیے بے قراری تھی، بالکل اسی طرح کی بے قراری تھی جس طرح کسی پیاسے کو ہوتی ہے۔

جہاں تک علامہ قرضاوی کی یہ بات ہے کہ: مسلم معاشرے میں جمہوریت خود بخود

شریعت کی پابند ہوگی، وہاں حاکمیتِ الٰہ اور حاکمیتِ جمہور کا جھگڑا نہیں ہوگا، تو ایسا کس مسلم معاشرے میں ہوا ہے؟ کیا آج اس روئے زمین پر کوئی ایسا مسلم معاشرہ ہے، جس نے جمہوری نظام کو اس روح اور اس اسپرٹ کے ساتھ اپنایا ہو؟

یہ محض اک خوش فہمی یا خوش گمانی ہے، جس کا عملی دُنیا میں نہ کہیں وجود ہے، نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے!

یہاں گفتگو چل رہی تھی مولانا مودودی کے نظریۂ جمہوریت کی۔ جمہوریت پر مولاناؒ کی گفتگو بہت ہی پہلودار، اور بڑی جان دار ہے۔ اسے مکمل طور سے سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ براہ راست مولانا کی تحریروں پر غور کیا جائے۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں:[1]

> ہم جمہوری حاکمیت کے بجائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی (monrarchy)، اور امیروں کے اقتدار، اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں، جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہوسکتا ہے۔
>
> اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہوسکتا ہے۔
>
> ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکمرانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا چاہیے۔
>
> ہم بھی اس نظام زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لیے اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی، اور سعی و عمل کی آزادی نہ ہو۔ یا جس میں پیدائش اور نسل اور طبقات کی بنا پر بعض لوگوں کے لیے مخصوص حقوق، اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔

یہ اُمور، جو جمہوریت کا اصل جوہر (essence) ہیں، ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی

ا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی 'جماعت اسلامی کی دعوت' ماہ نامہ 'ترجمان القرآن' لاہور، ستمبر ۱۹۴۸ء

جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہو۔ ہم اس جمہوریت کو اس وقت سے جانتے ہیں، اور دُنیا کو اس کا بہترین عملی نمونہ دکھا چکے ہیں، جب کہ مغربی جمہوریت پرستوں کی پیدائش میں ابھی سیکڑوں برس کی دیر تھی۔

دراصل، ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے، اور ہم اس کو حقیقت کے اعتبار سے غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہی (sovereignty) صرف اس کا حق ہے جس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

مولانا مودودی مزید فرماتے ہیں:

نتائج کے اعتبار سے انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ خدا کو حاکم مان کر انسانی زندگی کا نظامِ حکومت، خلافت و نیابت کے نظریے پر بنایا جائے۔ یہ خلافت بلاشبہہ جمہوری ہونی چاہیے۔ جمہور کی رائے ہی سے حکومت کے امیر یا ناظمِ اعلیٰ کا انتخاب ہونا چاہیے۔ انھی کی رائے سے اہل شوریٰ منتخب ہونے چاہییں۔ انھی کے مشورے سے حکومت کے سارے انتظامات چلنے چاہییں۔ ان کو تنقید و احتساب کا کھلا حق ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ اس احساس و شعور کے ساتھ ہونا چاہیے کہ ملک خدا کا ہے۔ ہم مالک نہیں بلکہ نائب ہیں۔ اور ہمیں اپنے ہر کام کا حساب اصل مالک کو دینا ہے۔ نیز وہ اخلاقی اصول اور وہ قانونی احکام اور حدود اپنی جگہ اٹل ہونے چاہییں، جو خدا نے ہماری زندگی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔

مولانا مزید فرماتے ہیں:

پھر یہ ضروری ہے کہ اس پورے نظام تمدن وسیاست کی کارفرمائی، اور اس کا انتظام ان لوگوں کے سپرد ہو، جو خدا سے ڈرنے والے، اس کی اطاعت کرنے والے، اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں۔ جن کی زندگی گواہ ہو کہ وہ خدا کے حضور اپنی پیشی اور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں۔ [۲]

یہ ہے مولانا مودودی کا تصور جمہوریت! یہ نہ مذہبی تشدد ہے، نہ مغربی تہذیب کا ردعمل! یہ ہے دینی بصیرت اور اسلامی حمیت! یہ ہے بے پناہ داعیانہ تڑپ جو مغربی جمہوریت کو 'مسلم' بنانے اور اسے اسلامی خلافت کے سانچے میں ڈھالنے پر مصر ہے!

مولانا مودودی نے اسلام اور جاہلیت کی جو تشریح کی ہے، اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہے۔ علماء ومشائخ کو بھی اعتراض ہے اور مسلمانوں کے حکمرانوں کو بھی اعتراض ہے۔

یہ گفتگو جو خالص کتاب وسنت کی ترجمان ہے، یہ گفتگو مسلم دُنیا کے لیے حلق کا کانٹا بن گئی ہے۔ علامہ قرضاوی کا بھی خیال ہے کہ مولانا مودودی نے اس سلسلے میں بہت سخت موقف اختیار کیا ہے۔

غور کیا جائے تو یہاں پر بھی مولانا مودودی ہی واضح طور سے حق بجانب نظر آتے ہیں۔ اسلام اور جاہلیت کی علامہ نے جو تشریح کی ہے، وہ صد فیصد صحیح اور قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔

جن لوگوں کو مولانا مودودی کے 'نظریہ اسلام وجاہلیت' سے بے چینی ہے، ان کی بے چینی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے، بلکہ ان کی بے چینی اس بات پر ہے کہ اگر وہ تشریح صحیح مان لی جائے تو دُنیا بھر کے وہ سارے معاشرے جو آج 'مسلم معاشرے' سمجھے جاتے ہیں، یا جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں، وہ سب جاہلیت زدہ معاشرے قرار پائیں گے۔

حد یہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ طبقات، اور عرب وعجم کے وہ حکمراں، جو رات دن اسلام کی مخالفت اور خدا اور رسول سے بغاوت میں مصروف رہتے ہیں، اِنھیں بھی یہ اصرار ہے کہ اِنھیں خادم اسلام اور پاسبان حرم کہا جائے، اور اِن پر جاہلیت زدہ ہونے کا الزام نہ لگایا

جائے۔

امام سیّد قطب شہید کو تختۂ دار پر چڑھانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ انھوں نے اسلام اور جاہلیت

۲۔ ماہ نامہ تُرجمان القرآن ' لاہور، ستمبر ۱۹۴۸ء

کی جو تشریح کی، اس کی زد خونخوار فرعون مصر جمال عبدالناصر پر بھی پڑ رہی تھی، اور ان تمام لوگوں پر پڑ رہی تھی، جو اس کی فرعونیت کے گن گا رہے تھے، یا جو اس کی فرعونیت پر چپ سادھے ہوئے تھے۔

اس کی زد میں وہ علماء و مشائخ بھی آئے، جو مغربی تہذیب اور کلچر کے دل دادہ تھے، یا جو آخرت سے زیادہ دُنیا کے طالب تھے، جن کی زندگیاں آخرت فراموشی اور دُنیا طلبی کا بدترین نمونہ تھیں۔

مولانا مودودی نے اسلام اور جاہلیت کی جو تشریح کی ہے، اس کی زد ان تمام حکام و سلاطین پر بھی پڑتی ہے، جو ہماری تاریخ کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں، چاہے وہ جس دور کے بھی ہوں۔

ظاہر ہے وہ سارے لوگ جن کے ہاتھوں میں اقتدار آیا، اور اس سے اُنھوں نے اسلام کی خدمت و اشاعت اور اسلام کی نمائندگی نہیں کی، اور پورے نظام سلطنت کو اسلامی شریعت کے تابع نہیں رکھا، جنھوں نے اپنے اقتدار سے اسلام اور اہل اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے، اپنی اور اپنے خاندان کی دُنیا سنوارنے کی کوشش کی، وہ اگر جاہلیت زدہ نہیں تھے تو اور کیا تھے؟

اسلامی خلافت یا اسلامی حکومت ملکی فتوحات کا نام نہیں ہے، نہ اس کا نام ہے کہ بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں، لوگ تو آج بھی اسلام میں داخل ہو رہے ہیں، اور بھاری تعداد میں داخل ہو رہے ہیں، بھارت میں بھی داخل ہو رہے ہیں، یورپ، امریکا، اور چین جاپان میں بھی اسلام قبول کر رہے ہیں، اور ان سارے ملکوں میں بھی اسلام کی طرف لپک لپک کر آ رہے ہیں، جہاں اسلام کو مٹانے کی منظم کوششیں ہو رہی ہیں۔

اسلامی حکومت تو اس کا نام ہے کہ حاکم اپنی پوری زندگی میں سچا مسلم اور اللہ

ورسول ﷺ کا تابع فرمان ہو، اور اس کا پورا نظامِ سلطنت شریعت کے تابع اور شریعت کے رنگ میں رنگا ہوا ہو، اس کے ہاں ظلم وزیادتی نام کی کوئی چیز نہ ہو، اور ہر ایک کو کلمۂ حق کہنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خلفائے اربعہ اور خلیفہ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کس کا نام لیا جا سکتا ہے؟

اب اگر ہماری تاریخ میں خلفاء وسلاطین کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے، مگر اُنھوں نے نہ اپنی ذات کو، نہ نظامِ سلطنت کو مکمل طور سے اسلامی شریعت کا پابند رکھا، تو یہ جاہلیت نہیں تھی، تو اور کیا چیز تھی؟

قرآن پاک میں جن بزرگ اصحاب رسول کی بار بار تعریف کی گئی ہے اور وجد آفریں انداز میں کی گئی ہے، وہ صحابہ کرام ہیں، جنھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہوکر غلبۂ اسلام کے لیے اپنی جانیں لڑائیں، اور ہر طرح کی جانی ومالی قربانیاں پیش کیں، ان سے محبت رکھنا اور جان ودل سے ان کا احترام کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، اور وہی لوگ صحیح معنوں میں اسلام کے نمائندے تھے۔

ان کے سلسلے میں جتنی بھی غلط باتیں تاریخ میں آئی ہیں، جو ان کے شایانِ شان نہیں ہیں، وہ سب باتیں اس قابل ہیں کہ انھیں ٹھکرا دیا جائے، اور بے تکلف کہہ دیا جائے:

سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْم [النور ۲۴:۱۶] سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔

البتہ جو لوگ ان کے بعد کے ہیں، جن کا سب سے بڑا کارنامہ اقتدار کے لیے کشمکش اور اقتدار کے لیے خوں ریزی رہا ہے، ان کی وکالت کرنا اور ان کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کو نظر انداز کرنا، اور ان بادشاہوں کی فتوحات پر فخر کرنا یہ کسی طور سے ہمارے شایانِ شان نہیں ہے۔

کچھ اچھے کام تو ہر حکمراں کے ہاں مل جاتے ہیں۔ اگر سیکڑوں سال پر پھیلی ہوئی مسلمانوں کی تاریخ میں سے کچھ اچھے اور قابل ذکر کام ہم چن لیں، اور ان کا گلدستہ تیار کر کے کہیں: یہ ہے ہماری تاریخ اور اس کے کارنامے۔ اور انھی کے پہلو بہ پہلو جو دوسرے بہت سے

کام ہیں، جن پر ایک حساس اور دردمند مسلمان سر پیٹ کر رہ جاتا ہے، اور بسا اوقات خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوجاتا ہے، ان سب کاموں سے صرف نظر کرلیں، تو یہ کہاں کا انصاف اور کہاں کی حقیقت پسندی ہوگی؟

یہاں مسئلہ ملکی فتوحات یا کچھ اچھے کاموں یا کارناموں کا نہیں، بلکہ اسلامی نظام حکومت اور اسلامی آداب حکمرانی کی سچی اور مکمل نمائندگی کا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ پر مولانا مودودی کی تنقیدیں اور تبصرے اور اسلام کے بے لوث پیمانوں کی روشنی میں حکام وسلاطین کا بے لاگ احتساب، یہ علامہ کا زبردست کارنامہ ہے۔

یہاں پر علامہ قرضاوی کی یہ توجہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ: ہماری اسلامی تاریخ اپنی اصل شکل میں مدوّن نہیں ہوئی ہے، اس میں واقعات کی صحیح اور سچی تصویر نہیں پیش کی گئی ہے۔ اسے بڑی مہارت کے ساتھ بگاڑنے اور بدنما و بدرنگ بنانے کی منظم کوشش ہوئی ہے۔

اور یہ تنہا علامہ یوسف قرضاوی کا رجحان ہی نہیں ہے، بلکہ ان سے پہلے امام سیّد قطب، علامہ علی طنطاوی اور دوسرے محققین بھی یہی بات کہہ چکے ہیں۔ اس موضوع پر علامہ یوسف قرضاوی کی ایک مستقل تصنیف بھی ہے 'تاریخنا المفتری علیه' یعنی ''ہماری تاریخ، جو بگاڑ دی گئی ہے''۔

لیکن سانحہ یہ ہے کہ اس وقت دُنیا کے ہاتھوں میں وہی بگڑی ہوئی تاریخ ہے، اور اسی بگڑی ہوئی تاریخ کو لے کر اسلام پر حملے کیے جاتے ہیں، اور اس کی نہایت گھناؤنی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہی بات کہی جاسکتی ہے جو مولانا مودودی نے فرمائی ہے، کہ:

''یہ دین اسلام کی تصویر نہیں ہے، بلکہ جاہلیت کی تصویر ہے۔''

اب اگر اسلامی تاریخ کی نئی تدوین ہوجائے، اور اس کی اصل تابناک تصویر سامنے آجائے، تو چشم ما روشن دل ما شاد! پھر تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوجاتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مولانا مودودی نے اسلام اور جاہلیت پر تو زورِ قلم صرف کیا، اسلام کیا ہے؟ اور جاہلیت کیا ہے؟ ان دونوں میں بنیادی فرق کیا ہے؟ کیا ان دونوں کا یکجا ہونا ممکن ہے؟ مسلم اُمت کی موجودہ حالت اسلام کی نمائندگی کر رہی ہے یا جاہلیت کی؟ ان موضوعات پر مولانا نے جم کے لکھا، اور پوری جرأت کے ساتھ لکھا۔ لیکن کسی پر بھی اُنھوں نے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا، مسئلہ تکفیر ایک الگ مسئلہ ہے، جس کا اس مسئلہ اسلام و جاہلیت سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا مودودی سے پہلے کسی نے اسلام اور جاہلیت پر اس طرح کھل کر گفتگو نہیں کی، مگر مسئلہ تکفیر کا جہاں تک تعلق ہے، تو یہ کاروبار تو مولانا مودودی کے عالم وجود میں آنے سے بہت پہلے سے چل رہا ہے، اور بہت زور و شور سے چل رہا ہے۔

اس اُمت کے جتنے مصلحین اور مجددین گزرے ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو، جس پر تکفیر کے تیر نہ برسائے گئے ہوں، اور اس کا دامن تار تار نہ کیا گیا ہو۔ خود مولانا مودودی بھی اس تیر سے خوب خوب لہولہان ہوئے ہیں، اور بری طرح ان کی شخصیت کی دھجیاں اُڑائی گئی ہیں۔ لہٰذا، مولانا مودودی کو فتنۂ تکفیر کا ذمہ دار قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟

آج تکفیر کا ترکش ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جن کا مولانا مودودی اور تحریک اسلامی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ایسی صورت میں فتنۂ تکفیر کا سہرا مولانا مودودی کے سر باندھنا مولانا کے ساتھ بھی زیادتی ہے، اور ان لوگوں کے ساتھ بھی زیادتی ہے، جو بہت زمانے سے یہ 'کارِ عظیم' انجام دیتے آئے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں اس کے حق دار ہیں کہ انھیں یہ تاج پہنایا جائے!

علامہ قرضاوی کی زیر نظر کتاب ہمارے لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ اُنھوں نے مولانا مودودی کی شخصیت کا جو تجزیہ پیش ہے، اور جس طرح بے باکی اور فیاضی کے ساتھ ان کی عظیم خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے، یہ خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ غالباً یہاں یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اگر علامہ قرضاوی نے اعتراف عظمت کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی پر کچھ گرفت بھی کی ہے، تو اس سے ان کی عظمت میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی۔

بالکل یہی صورت حال علامہ قرضاوی کی ہے۔ اگر راقم الحروف نے ان سے اختلاف کیا ہے، یا ان کے اعتراضات پر کچھ اظہار خیال کیا ہے، تو اس سے ان کی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

بے شک یہ دونوں بزرگ اُمت مسلمہ کے گل سر سبد ہیں۔ یہ آسمان اسلام کے چمکتے دمکتے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کی چاندنی اور ان کی روشنی سے کتنے ذہن اور کتنے دل و دماغ روشن ہوئے، اور ہو رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا کسی کے بس میں نہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے فرعون کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کی روشنی کو دبا سکے، یا ان کے چراغ کو بجھا سکے: ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ [المائدہ ۵: ۵۴]۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ضرورت تھی کہ علامہ قرضاوی کی اس گراں قدر کتاب کو اردو کا پیرہن بھی پہنایا جائے۔ یہ سعادت عزیزی ابوالاعلیٰ سیّد سبحانی کے نصیب میں لکھی تھی۔ اُنھوں نے بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی کے ساتھ اس کے لیے خوبصورت اردو پیرہن تیار کیا، جو اس کتاب کے شایان شان ہے۔ اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو شرف قبول عطا فرمائے، اور لوگوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ آمین

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

❖❖❖

مقدمہ

الحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه، كماينبغي لجلال وجهه وعظيم سلطانه، والصلوة والسلام على سيدنا محمد، رحمة الله للعالمين، وحامل هدايته للمؤمنين، (يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ)، وعلى آله وصحبه ومن اتَّبعهم باحسان الى يوم الدين۔ امابعد

یہ کچھ اوراق ہیں جو میں نے بہت پہلے تحریر کیے تھے۔۔۔امام ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات کے ایک سال بعد مجھ سے ان کے کچھ نیازمندوں نے خواہش کی کہ فکرمودودی پر کچھ لکھوں کہ اس کی کیا خصوصیات ہیں؟ اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں ملک وملت پر؟

میں نے اسی وقت اس موضوع پر لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن اس وقت میں اسے مکمل نہ کرسکا۔ اس طرح یہ اوراق میرے پاس نامکمل پڑے رہے، اور ان پر ایک عرصہ گزر گیا۔

ان دنوں قدرت کا اشارہ ہوا کہ میں اس کام کے لیے کچھ وقت نکالوں، اور اس کو جس طرح ہو سکے، اپنے منصوبے کے مطابق مکمل کروں، اس طرح یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی اور ’نظرات فی فکر الامام المودودی‘ کے نام سے منظر عام پر آرہی ہے۔

کوئی بھی مسلم اسکالر امام مودودی کی امامت اور عبقریت میں شک نہیں کرسکتا۔ یہ امامت اور عبقریت نمایاں ہے ان کے وسیع اسلامی فکر میں، جو اسلام کے گوناگوں مسائل سے بحث کرتا ہے۔ قرآن مجید کی مکمل تفسیر، سنت رسول پر تحقیقی مقالات، خود کو اہل قرآن کہنے والوں کی تردید، جن

کا کہنا ہے کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر اعتبار نہیں۔ وہ احادیث، جن کی اُمت نے روایت وحفاظت کی ہے۔ اور جن کی حفاظت کے لیے نوے علوم کی بنیاد رکھی جو سب کے سب علم حدیث سے تعلق رکھتے ہیں اور ان علوم پر زبردست لائبریری تیار ہوگئی، ان علوم کی ترقی اور آبیاری میں علماء نے اپنی زندگیاں لگا دیں۔

امام مودودی نے زندگی کے ان تمام مسائل پر توجہ دی جو اُمت مسلمہ سے تعلق رکھتے ہیں، فرد کی زندگی ہو، خاندان کی زندگی ہو، معاشرے کی زندگی ہو، اُمت کی زندگی ہو، حکومت اور ریاست کی زندگی ہو، ساری دُنیا سے تعلقات کا معاملہ ہو، ان تمام متنوع مسائل اور موضوعات پر مولانا نے اظہارخیال کیا۔ عقیدہ ہو، عبادات ہوں، اخلاق ہو، قانون ہو، معیشت اور سیاست ہو، تاریخ اور زندگی کے مختلف مسائل ہوں، ان سب پر مولانا نے قلم اُٹھایا، اور اسلامی دعوت، اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کے تمام مخالفین کا بھرپور جواب دیا۔

امام مودودی اپنی تحریروں میں ایک جہاں دیدہ شہسوار اور دودھاری تلوار نظر آتے ہیں۔ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں بے دھڑک لکھتے ہیں، جس بات پر مطمئن ہوتے ہیں اور جسے حق سمجھتے ہیں، اس کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں نہ تو کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا کرتے ہیں، نہ کسی فرعون کی فرعونیت سے ڈرتے ہیں، کوئی سیکولرزم کا علم بردار ہو، یا کوئی قدامت پرست ہو، یا کوئی مغربیت زدہ ہو، یا کوئی خوں خوار ظالم ہو، وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

ان کے افکار سے دُنیا بھر کے اہل اسلام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے ان کی اکثر کتابوں کا مطالعہ دورِ جوانی میں کیا تھا، میں ان کی شخصیت، اور ان کے افکار میں موجود حقیقت پسندی، مضبوطی اور ان کی تحقیقی روح سے کافی متاثر ہوا تھا، گرچہ بعض جزئیات میں ان سے اختلاف بھی رہا۔

حق پرست اور مخلص اسلامی مفکرین کے شایانِ شان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے استفادہ بھی کریں اور ایک دوسرے پر تنقیدی نظر بھی رکھیں۔ معصوم تو صرف

رسول پاک ﷺ کی ہی ذات پاک ہے، کیونکہ آپ ﷺ کچھ بھی اپنے جی سے نہیں بولتے تھے۔ آپ ﷺ کے علاوہ ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی تمام باتیں ماننی ضروری نہیں ہوتیں، کچھ باتیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں، جو قابل قبول نہ ہوں۔

اس موقعے پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے عزیز بھائی عبدالغفار عزیز کا شکریہ ادا کروں، جنھوں نے امام ابوالاعلیٰ مودودی سے فیض پایا ہے اور میرے بھی شاگرد ہیں، اور اس وقت وہ جماعت اسلامی پاکستان کے سیکرٹری برائے امور خارجہ ہیں۔

میں نے یہ کتاب اشاعت سے قبل ان کے پاس بھیجی تھی۔ انھوں نے اس کے لیے بعض مشورے دیے جنھیں میں نے قبول کیا۔ اسی طرح انھوں نے امام مودودی کی بعض تحریروں کے حوالے بھی فراہم کیے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ان تمام لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں میرے ساتھ کسی طرح کا تعاون کیا ہے۔

امام مودودی اور ان کے اسلامی فکر سے متعلق یہ کتاب اب میں اپنے بھائیوں اور روحانی فرزندوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، اُمید ہے وہ اس کا مطالعہ کریں گے اور اس پر غور وفکر کریں گے، ممکن ہے انھیں اس میں کچھ مفید چیزیں مل جائیں، یا انھیں اس سے کچھ آسودگی حاصل ہوسکے، یا ان کی کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے۔

اپنی یہ گفتگو میں اللہ کے نبی شعیب علیہ السلام کے اس جملے پر ختم کرتا ہوں:

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (ھود ۱۱: ۸۸) میرا مقصد سوائے اصلاح کے اور کچھ نہیں، اور جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں یہ کام کرتا رہوں گا۔ میری کامیابی اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں اسی پر بھروسا رکھتا ہوں، اور اسی سے لو لگاتا ہوں۔

رحمت کا آرزومند

یوسف القرضاوی

۲۷ رصفر ۱۴۳۳ھ، ۲۱ رجنوری ۲۰۱۲ء

مولانا مودودی: بحیثیت مفکر

انٹرٹائٹل

دُنیا میں ایسے ادیب ہوتے ہیں، جو اظہار و بیان کا زبردست ملکہ رکھتے ہیں، مختلف اسالیب میں بات پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں، وہ اپنی فطری شاعری یا اچھوتے طرزِ تحریر سے لوگوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔

ایسے علماء بھی پائے جاتے ہیں، جو تحقیق و تدقیق کی قدرت رکھتے ہیں، وہ راجح اور مرجوح، صحیح اور ضعیف اور صحیح و صحیح تر میں امتیاز کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ پھر ہمارے درمیان ایسے داعی بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے عوام کے دلوں کو مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔لیکن ضروری نہیں کہ ہر ماہر ادیب، ہر محقق عالم، اور ہر جادو بیان داعی مفکرین کے زمرے میں شامل کر لیا جائے۔

مفکر وہ ہوتا ہے جو غور و فکر اور دقیقہ رسی کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہو۔ انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر اس کی خاص نگاہ اور مستقل رائے ہو، اور وہ فلاں اور فلاں کا مقلد نہ ہو۔

مفکرین کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں، کچھ علاقائی یا مقامی مفکر ہوتے ہیں، کچھ عالمی سطح کے اور تمام انسانیت کے مفکر ہوتے ہیں، کچھ بالکل آزاد مفکر ہوتے ہیں، وہ نہ کسی اصول کے پابند ہوتے ہیں، نہ کسی فکر کی بندش قبول کرتے ہیں۔

کچھ مفکر ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص عقلی فلسفے یا نظریے کے پابند ہوتے ہیں، اسی کے

حدود میں سوچتے، اور اسی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ ہم آج کے دور میں دیکھتے ہیں، کہ کوئی مارکسی مفکر ہوتا ہے، کوئی وجودی مفکر ہوتا ہے۔ کوئی مسیحی مفکر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح کوئی اسلامی مفکر ہوتا ہے۔

ہمارا عالم اسلام اوائل ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۳ر ستمبر ۱۹۷۹ء کو عالمی سطح کے ایک بے مثال اسلامی مفکر سے محروم ہو گیا۔ قوموں کی تاریخ میں بہت ہی کم ایسے مفکر پیدا ہوتے ہیں، یہ استاذ ابوالاعلیٰ مودودی تھے، برعظیم ہندو پاک میں جماعت اسلامی کے بانی، جن کی کتابیں دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، اور روشنی کی سی رفتار سے دُنیا بھر میں پھیل گئیں۔

ہزاروں لاکھوں افراد، جن میں دُنیا بھر کے فرزندان اسلام اور ان کی اسلامی تحریکات شامل ہیں، ان کی تحریروں سے مستفید ہوئے۔ ان تحریروں نے اسلام مخالف پروپیگنڈوں اور اسلام پر ہونے والے حملوں: خواہ وہ اندرونی دشمنوں کی جانب سے ہوں یا بیرونی دشمنوں کی جانب سے، ان کا فکری سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے بہترین ہتھیار کا کام کیا۔ اسی طرح یہ تحریریں ان کے لیے تحریکی سفر میں روشن قندیلیں ثابت ہوئیں۔

دوسری طرف ان فکر انگیز تحریروں اور کتابوں کے خلاف مختلف افراد اور جماعتوں کی جانب سے ایک زبردست تنقیدی مہم کا آغاز ہوا۔ ان افراد اور جماعتوں کے اغراض اور انداز مختلف تھے، اسباب و محرکات بھی مختلف تھے، لیکن وہ سب کے سب مولانا مودودی کے فکر اور ان کی دعوت کی مخالفت میں ایک تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے آنکھ بند کر کے ہر ہر بات میں مخالفت کی، اور کسی کی مخالفت کچھ باتوں تک محدود تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مولانا مودودی کے مخالفین یا ناقدین کی اکثریت برعظیم ہندو پاک سے تعلق رکھتی تھی نہ کہ بیرون ہند سے، اس کے کچھ مخصوص اسباب تھے، جن پر آگے گفتگو آئے گی۔ تاہم یہ بات بڑی واضح ہے کہ یہ خالص علمی اور فکری اختلاف نہیں تھا۔

فکر مودودی کی خصوصیات

فکر مودودی کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے سب سے نمایاں کر دیتی ہیں، اس کی کچھ ایسی خوبیاں ہیں، جو اسے سب سے منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ان خوبیوں اور ان خصوصیات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس فکری صورت حال کو جانیں اور سمجھیں جو اس وقت غیر منقسم ہندستان اور عمومی طور پر پورے عالم اسلام میں پائی جاتی تھی۔ ضروری ہے کہ ہم ان حالات سے واقف ہوں، جبکہ مولانا مودودی نے فکری میدان سنبھالا تھا، اور وہ اپنے قلم اور زبان سے چومکھی جنگ لڑ رہے تھے، اور اپنے استدلال اور بیان کی قوت سے اسلام کے حریفوں اور دشمنوں سے نبرد آزما تھے۔

یہ چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر اور بیسویں صدی عیسوی کی دوسری چوتھائی کا ابتدائی زمانہ تھا۔

اُس زمانے کا منظر نامہ

مولانا مودودی جس وقت میدان میں آئے، اس وقت تک مسلم ممالک میں مغربی جاہلیت اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔ کیونکہ خلافتِ عثمانیہ [۱۲۹۹ء-۱۹۲۲ء] کا سورج غروب ہو چکا تھا، مغربی سامراج اپنی فوج وسپاہ کے ساتھ، اور اپنی سیاسی چالوں کی بدولت مسلم دُنیا پر غالب آ چکا تھا، اور جن ملکوں پر اسے غلبہ حاصل ہوا، ان کے ذہن ودماغ کو وہ مفلوج کر چکا تھا۔ اس وقت اسلامی دُنیا میں جو فکر یا جو ذہن پھیلا ہوا تھا، اسے درج ذیل خانوں میں ہم بانٹ سکتے ہیں:

تقلیدی ذہن

تقلیدی ذہن جو بری طرح قدامت پرستی کا شکار تھا، جس کی سوچ یہ تھی کہ قدماء نے بعد والوں کے لیے کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، اجتہاد کا دروازہ اب بند ہو چکا ہے۔ تقلید بہرحال لازمی ہے، اور مسلک کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی کوشش خود دین سے نکل جانے کے ہم معنی ہے۔

یہ فکر رکھنے والے ہنوز قدیم فکری معرکوں میں جی رہے تھے، جو انھیں قدیم علم کلام سے

وراثت میں ملے تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ لد گیا۔ آج دوبارہ ان کے ظہور پذیر ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا، کہ ان پر معرکہ آرائی کی جائے، ایک ایسے دشمن کے خلاف معرکہ آرائی کی جائے، جس کا آج کہیں وجود نہیں۔

اسی طرح ان کو قدیم فقہاء کے ہاں بہت سے ایسے مسائل ملے، جو کب کے گزر گئے، ان کا زمانہ کب کا ختم ہو گیا، لیکن یہ لوگ آج تک انھی مسائل سے چمٹے ہوئے تھے۔

مختصر یہ کہ یہ لوگ ہر نئی بات سے چڑتے تھے، اور ہر تجدیدی کام کو ٹھکراتے تھے، اجتہاد کا دروازہ ان کے ہاں بالکل بند تھا، ان کا نعرہ تھا کہ: ''ہر قدیم چیز کو علیٰ حالہٖ برقرار رہنا ہے، اگرچہ زمان و مکان اور انسان کے اندر کتنی ہی تبدیلیاں واقع ہو جائیں۔''

کاش، وہ اس قدیم پر اصرار کرتے جو صحیح معنوں میں قدیم ہے، اور زندگی کی توانائیوں سے مالامال ہے، مگر وہ تو اس قدیم پر اصرار کرتے ہیں جو فقہائے متأخرین کا قدیم ہے، ان فقہاء کا قدیم جن کے نصیب میں تھا کہ وہ جمود، پس ماندگی، اور رجعت پسندی کے ماحول میں زندگی گزاریں۔

اور کون جانتا ہی کہ اگر انھیں ہمارا زمانہ ملا ہوتا، اور اس زمانے کی زبردست تبدیلیوں کا اُنھوں نے مشاہدہ کیا ہوتا، تو ان کی بہت سی آراء بدل جاتیں، اور بہت سے معاملات میں ان کا موقف کچھ اور ہوتا۔

ہم سب یہ حقیقت جانتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ [م: ۱۹ جنوری ۸۲۰ء] کی نسبت سے دو مسلک پائے جاتے ہیں: ایک مسلک قدیم، دوسرا مسلک جدید۔ کہا جاتا ہے قدیم مسلک میں شافعی کی رائے یہ ہے، اور جدید مسلک میں شافعی کی یہ رائے ہے۔

یہی حال اصحابِ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [م: ۱۴ رجون ۷۶۷ء] کا ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کی تہائی سے زیادہ آراء سے اختلاف کیا۔ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ [م: ۷۹۵ء] اور امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ [م: ۲ راگست ۸۵۵ء] سے ایک ہی مسئلے میں کئی کئی روایات ہیں، اور ان

کے اصحاب نے ان سے کئی کئی اقوال نقل کیے ہیں، جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف اور متغایر ہیں۔ یہ سب کچھ زمانے، علاقے اور صورت حال کے فرق کا لحاظ کرنے کا نتیجہ تھا۔

ہندستان میں حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ [م: ۲۰ راگست ۱۷۶۲ء) نے اس فکری جمود کو جھنجوڑا تھا، اور اس کے ماننے والوں کو نیند سے بیدار کرنے کا کام کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہندستان میں بہت سے لوگ اسی قدامت سے چمٹے رہے اور اسے دانتوں سے پکڑے رہے۔ ان کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ: ''متاخرین احناف نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ تحقیق اور تدقیق کی انتہا ہے، اس سے ذرا بھی ہٹنا جائز نہیں ہے، اور اس طرح کی کوئی بھی کوشش دین سے فرار اور کتاب وسنت کی پیروی سے گریز کے ہم معنی ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی کی تقلید پورے ہندستان میں عام تھی، اس کے علاوہ بھی ہر مسلک کے ماننے والے کا اپنے مسلک سے چمٹے رہنا ہی وہاں کا دستور تھا۔ عقائد کے باب میں اشاعرہ یا ماتریدیہ کے مسلک سے چمٹے رہنا، فقہ میں عمومی طور پر فقہ حنفی اور کہیں کہیں فقہ شافعی کی تقلید، اسی طرح تصوف سے گہری وابستگی، اور سلوک وطریقت میں امام جنید بغدادیؒ [م: ۹۱۰ء] کی مکمل پیروی۔

بالکل اسی طرح کی کیفیت جامعۃ الازہر کی تھی، جب ازہر کے ماتحت اداروں کے ثانوی درجات میں داخلِ نصاب کتاب الجوہرۃ فی علم التوحید کی شرح میں ہمیں یہ شعر پڑھایا جاتا تھا:

ومالک وسائر الائمة
كذا ابو القاسم هداة الأمة
فواجب تقليد حبر منهمو
كما حكى القوم بلفظ يفهم

مالک اور بقیہ تمام ائمہ، اسی طرح ابوالقاسم امت کے رہنما ہیں۔ ان میں سے کسی نہ کسی

امام کی تقلید واجب ہے، جیسا کہ لوگوں نے صاف صاف لفظوں میں لکھا ہے۔

یہاں امام مالک کے ساتھ سائر الائمۃ سے مراد امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام ابن حنبل ہیں، اور ابوالقاسم سے مراد تصوف اور روحانی تربیت کے امام جنید بغدادی ہیں، اس طرح وہ فقہ میں بھی تقلید کو واجب قرار دیتا ہے اور تصوف وسلوک میں بھی۔

خرافاتی نظریہ

اس وقت دوسرے مسلم ملکوں کی طرح غیر منقسم ہندستان میں بھی، ایک اندازِ فکر پھیلا ہوا تھا، جس کا بازار چمکا ہوا تھا۔ ہر طرف اس کی دھوم دھام تھی، باقاعدہ اس کے پروہت اور پیروکار تھے، اور عوام میں جگہ جگہ اس کے حلقے قائم تھے، یہ تھا خرافاتی اندازِ فکر۔

یہ اندازِ فکر رکھنے والے تصوف سے اپنی نسبت جوڑتے، اور صوفیوں کے ہاتھ پیر چومتے، حالانکہ حقیقی تصوف سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ لوگ حقیقت میں قافلے سے بچھڑے ہوئے لوگ تھے، کائناتی قوانین سے بھی ناواقف، اور شرعی قوانین سے بھی نابلد۔

انھوں نے اس عالم کو ایک ایسا عالم تصور کیا، جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے، نہ نظام۔ وہ اپنے لیے اور اپنے پیروں کے لیے غیب دانی کا دعوی کرتے۔ ان کا دعویٰ تھا، کہ وہ مصیبتیں دور کر سکتے، اور فطری قوانین عالم کے خلاف جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

یہ تصور زندہ پیروں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ گزرے ہوئے پیروں کے بارے میں بھی یہی تصور تھا۔ ان کی قبروں اور درگاہوں کی وہ زیارت کرتے، خانہ کعبہ کی طرح ان کی قبروں کا طواف کرتے، ان کے لیے نذریں مانتے، ان پر جانور ذبح کرتے، قبر والوں سے مدد مانگتے، مشکل کشائی اور ضرورت برآری کے لیے ان سے التجائیں کرتے۔

ان عوام کو ایسے لوگ نہیں ملے، جو ان کے عقائد کی اصلاح کریں، ان کی غلط فہمیوں کی تصحیح کریں، اور صحیح دین کی طرف ان کی رہنمائی کریں۔

اس کے برعکس انھیں ایسے پیر اور ایسے مشائخ ملے، جو ان کی بے دینی اور گمرہی پر ان کی پیٹھ ٹھونکتے، اور حوصلہ افزائی کرتے۔ عوام ان کی باتوں پر یقین کر لیتے، اس لیے کہ وہ علماء ومشائخ کی وضع قطع میں ہوتے، اور ایسے اقوال واشعار ان کی زبان زد ہوتے، جو دلوں کو گرمانے والے اور جذبات کو بھڑکانے والے ہوتے۔

عوام کو اپنی مٹھی میں کر لینے کا ایک حربہ اور بھی تھا۔ وہ طرح طرح کی کرامات کا دعویٰ کرتے، اور اپنی اندھی اطاعت ضروری قرار دیتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مریدوں کے ذہن میں اس طرح کی باتیں بٹھاتے:

جس نے پیرومرشد کی کسی بات پر کہا: ''ایسا کیوں؟'' وہ کبھی بامراد نہیں ہوسکتا!

انھوں نے کہا: ''پیرومرشد کے سامنے مرید کی وہی حالت ہونی چاہیے، جو غسل دینے والے کے سامنے مردے کی ہوتی ہے!''

وہ مُردوں سے اپنی مرادیں مانگتے، ان کی قبروں کو تبرک کے طور پر چھوتے اور بوسہ دیتے۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی فرضی قبریں بناتے، اور وہاں پہنچ کر وہ انھیں پکارتے کہ وہ ان کی مصیبتوں کے بادل چھانٹ دیں، انھیں ظالموں کے ظلم سے بچالیں!

ان کے بارے میں ان کا عقیدہ ہوتا کہ وہ نفع نقصان کے مالک ہیں۔ وہ چاہیں تو ان کی مدد کریں، اور چاہیں تو انھیں بے یارومددگار چھوڑ دیں۔

لوگوں پر ہونے والے مظالم، یا معاشرے میں کھلے عام ہونے والی برائیوں، یا خشک وتر میں پھیلے ہوئے شروفساد کے سلسلے میں ان کا موقف کبھی مثبت یا ایجابی نہیں رہا۔ وہ برائیاں ہوتے دیکھتے، اور خاموش رہتے! خاموش رہنے کی وجہ دریافت کی جاتی، تو کہتے:

''جو ان ظالموں، یا نافرمانوں کو (شریعت) کی نگاہ سے دیکھے گا، ان سے نفرت کرے گا، اور جو انھیں (حقیقت) کی نگاہ سے دیکھے گا، معذور قرار دے گا!''

گویا ان کے ہاں شریعت کچھ اور تھی، اور حقیقت کچھ اور!

ان لوگوں کے عقیدے کو شرک اور پیروں کی جبری اطاعت نے برباد کر دیا، ان کی عبادت بدعات اور غلو پسندی کی نذر ہوگئی، ان کے اخلاق کو ذلت پسندی اور منفی طرزِ عمل نے برباد کر دیا، اور ان کی عقلوں کو دوسروں کی اندھی تقلید لے ڈوبی۔

یہی وہ طرزِ فکر ہے جو بہت سے مسلم ملکوں میں تصوف کی شیدائی جماعتوں کے ہاں پایا جاتا تھا، لیکن ہندستان میں اس طرزِ فکر کی جڑیں زیادہ گہری تھیں، اور اس کے اثرات آبادی کے زیادہ وسیع حصّے میں پھیلے ہوئے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہندو مسلم ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ مسلم آبادیاں اور ہندو آبادیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ اصل مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا کہ کچھ لوگوں نے اسے تجارتی نقطہ نظر سے اختیار کیا تھا، جبکہ دوسرے لوگوں نے اسے اپنے باپ دادا اور ماحول سے وراثت میں پایا تھا، مگر اس کے احوال واذواق اور اس کے معارف کو کتاب وسنت کی ترازو میں نہیں تولا، نہ قرآن وحدیث کی پابندی کا وہ التزام کیا، جو التزام حضرت جنید بغدادی اور ان کے دوسرے بڑے بڑے شیوخ کیا کرتے تھے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی غیر منقسم ہندستان، جو آج بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کی شکل میں ہے، اس کی دینی اور مذہبی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے [۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو] فرماتے ہیں:

> اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو کسی علاقے میں جا کر عوام کی مذہبی حالت کا جائزہ لیجیے اور پھر تاریخ میں تلاش کیجیے کہ اسلام کے آنے سے پہلے اس علاقے میں کون سا مذہب رائج تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ آج بھی وہاں اس سابق مذہب سے ملتے جلتے عقائد واعمال ایک دوسری شکل میں رائج ہیں۔
>
> مثلاً جہاں پہلے بدھ مذہب پایا جاتا تھا، وہاں کسی زمانے میں بودھ کے آثار پوجے جاتے تھے۔ کہیں اس کا کوئی دانت رکھا ہوا تھا، کہیں اس کی کوئی ہڈی محفوظ تھی۔ کہیں اس

کے دوسرے تبرکات کو مرکز توجہات بنا کر رکھا گیا تھا۔ آج آپ دیکھیں گے کہ اس علاقے میں وہی معاملہ نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک، یا آپؐ کے نقش قدم یا دوسرے بزرگانِ دین کے آثار متبرکہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

اسی طرح آپ پرانے مسلم قبیلوں کے موجودہ رسم و رواج کا جائزہ لیں اور پھر تحقیق کریں کہ ان ہی قبیلوں کی غیر مسلم شاخوں میں کیا رسمیں رائج ہیں۔ دونوں میں آپ بہت کم فرق پائیں گے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ پچھلی صدیوں میں جو لوگ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار رہے ہیں۔ انھوں نے بالعموم اپنا فرض انجام دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ انھوں نے اسلام پھیلانے والے بزرگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ کروڑوں آدمی اسلام کی کشش سے کھنچ کھنچ کر اس کے دائرے میں آئے، مگر جو اسلام کے گھر کے منتظم اور متولی تھے، اُنھوں نے ان بندگان خدا کی تعلیم، تربیت، ذہنی اصلاح اور زندگی کے تزکیے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اس وجہ سے یہ قوم مسلمان ہو جانے کے باوجود اسلام کی برکات اور توحید کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند نہ ہو سکی اور ان نقصانات سے نہ بچ سکی، جو شرک و جاہلیت کے لازمی نتیجے ہیں۔

پھر دیکھیے کہ ان پچھلی صدیوں میں ہمارے علماء کا کیا حال ہے۔ چند مقدس بزرگوں نے تو فی الواقع اس دین کی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ جن کے اثرات پہلے بھی نافع ہوئے اور آج تک نفع بخش ثابت ہو رہے ہیں، مگر عام طور پر علمائے دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کو جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے ذوق نہ خود رکھا، نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر کوئی دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خوردبین بن کر رہ گئیں، دوربین وجہاں بین نہ بن سکیں۔

آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روزافزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصّے میں آئی ہے۔

صوفیاء کا حال دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چند پاکیزہ ہستیوں کے سوا جنھوں نے اسلام کے حقیقی تصوف پر خود عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی، باقی سب ایک ایسے تصوف کے معلم ومبلغ تھے، جس میں اشراقی اور ویدانتی اور مانوی اور زردشتی فلسفوں کی آمیزش ہوچکی تھی اور جس کے طریقوں میں جوگیوں اور راہبوں اور اشراقیوں اور رواقیوں کے طریقے اس اس طرح مل جل گئے تھے کہ اسلام کے خالص عقائد واعمال سے ان کو مشکل ہی سے کوئی مناسبت رہ گئی تھی۔ خلقِ خدا ان کی طرف خدا کا راستہ پانے کے لیے رجوع کرتی تھی اور وہ ان کو دوسرے راستے بتاتے تھے۔

پھر جب اگلوں کے بعد پچھلے ان کے سجادوں پر بیٹھے تو انھوں نے میراث میں دوسری املاک کے ساتھ اپنے بزرگوں کے مرید بھی پائے اور ان سے تربیت وارشاد کے بجائے صرف نذرانوں کا تعلق باقی رکھا۔ ان حلقوں کی تمام تر کوشش پہلے بھی یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جہاں جہاں بھی ان کی پیری وپیرزادگی کا اثر پھیلا ہوا ہے۔ وہاں دین کا صحیح علم کسی طرح نہ پہنچنے پائے۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی خداوندی کا طلسم اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے، جب تک وہ اپنے دین سے جاہل رہیں۔[1]

مغرب کی نقالی

وہاں اس خرافاتی فکر کے بالمقابل ایک (ذیلی فکر) بھی پایا جاتا تھا۔ اس ذیلی فکر سے مراد وہ فکر ہے، جس کی پہچان تھی مغرب کی نقالی، مغربی تہذیب کی ہم نوائی، مغربی قافلے کی حاشیہ برداری، مغربیت کے قدموں میں سجدہ ریزی!

اس فکر کے علم برداروں کا نام میں نے رکھا ہے ''مغربی فکر کے غلام'' کیونکہ یہ اس بیرونی فکر کے شاگرد نہیں تھے، کیونکہ شاگرد تو اپنے استاد سے کچھ سوال جواب کرتا ہے، اس کی کچھ باتیں مانتا ہے، اور کچھ کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے، مگر یہ تو اس تہذیب کے مکمل غلام تھے،

ا۔ مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل: مشمولہ روداد جماعت اسلامی ششم، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۶۶ء

سرتاپا غلام۔ ان کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ اس کی ہر بات کے آگے سرتسلیم خم کر دیتے۔ یہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس کے ہر خیر وشر کو ہماری اُمت میں پھیلائیں۔ ان کا نقطہ نظر تھا کہ تہذیب ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں تھا کہ اس کی سائنس اور ٹکنالوجی تو لے لی جائے اور اس کا فکر وفلسفہ اور اس کے ادبی اور نفسیاتی اصولوں کو ٹھکرا دیا جائے:

> اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر اس فکر کے علم برداروں نے مصر میں یہ نعرہ لگایا: 'ترقی کا راستہ بالکل واضح اور روشن ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اہل یورپ کے قدم بہ قدم چلیں، اور ان کی تہذیب کو گلے لگائیں'۔ اس کی اچھائیوں کو بھی اپنائیں، اور اس کی برائیوں کو بھی۔ اس کے شیریں کو بھی اپنائیں اور اس کے تلخ کو بھی۔ جو چیزیں پسندیدہ ہیں انھیں بھی اپنائیں اور جو چیزیں ناپسندیدہ ہیں انھیں بھی۔ جو چیزیں قابل تعریف ہیں انھیں بھی اپنائیں اور جو چیزیں قابل مذمت ہیں انھیں بھی۔ اور جو اس سے ہٹ کر سوچتا ہے، وہ یا تو فریبی ہے یا فریب خوردہ ہے۔'[۲]

جو نعرہ مصر میں لگایا گیا، بالکل وہی نعرہ ہندستان میں بھی لگایا گیا، اور دوسرے مسلم ملکوں میں بھی لگایا گیا۔

ہندستان میں اس فکر کے بڑے بڑے حامی پیدا ہوئے، جو کھلے بندوں مغربی تہذیب کی تقلید کا پیغام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں سر سیّد احمد خاں [م: ۲۷ / مارچ ۱۸۹۸ء] کا نام خاصا مشہور ہے، ان کے علاوہ بھی لوگ تھے، جو اس فکر کے سرگرم حامی تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کا اپنے دین، اپنے علمی وفکری ورثے، اور اپنی اُمت سے بالکل اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ یہ بس نام کے مسلمان تھے، جو کچھ موروثی چیزوں کو اپنائے ہوئے تھے۔

ضروری ہے کہ ان لوگوں کی فکر کو ''اسلامی فکر'' سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے، یہ خالص مغربی فکر تھی، گرچہ بسا اوقات یہ مشرقی زبانوں میں پیش کیا گیا۔

۲۔ طٰہٰ حسین، مستقبل الثقافۃ فی مصر، ص ۳۹/۲، دار المعرفۃ طبع دوم ۱۹۹۶ء

حقیقت کے لحاظ سے اس گروہ کے فکر اور مستشرقین (Orientalists) کے فکر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق تھا، تو بس اتنا کہ وہ اصل تھی، اور یہ اس کی نقل تھی [اور وہ بھی ناقص نقل]۔

یہ لوگ ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے چلتے، قدم سے قدم اور شانے سے شانہ ملا کے چلتے!

اس فکر کے ماننے والے کچھ دائیں بازو کے ہوتے، کچھ بائیں بازو کے، لیکن نتیجے کے لحاظ سے یہ سب مغربی فکر کے غلام تھے۔ چاہے ان کے تعلیمی اداروں اور ان کے نقطہ ہائے نظر میں کچھ اختلاف ہو، یہ سب حقیقت کے لحاظ سے ایک ہی درخت کی شاخیں تھیں، ذہن خالص مادہ پرست اور زندگی بالکل حیوانوں جیسی۔ یہ فکر جو مکمل طور سے مغربیت اور اس کی ثقافت اور اس کے مصادر (Sources) کی پابند ہوتی ہے، اس فکر میں ایمان بالغیب کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

اخلاقی قدروں کی اس تہذیب میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اخلاقی قدروں کے بغیر بھی ان کے ہاں کوئی زندگی اچھی زندگی ہوسکتی ہے۔ کسی زمانے اور کسی ماحول میں ایک چیز اچھی ہوجاتی ہے، وہی چیز دوسرے زمانے اور دوسرے ماحول میں رڈی اور ناکارہ ہوجاتی ہے۔

اس فکر کے علم برداروں کی طرف سے کتنی ہی بار جان توڑ کوششیں کی جاتی رہیں، فہم قرآن، فہم حدیث، اسلامی فقہ اور مسلمانوں کے علوم کا حلیہ بگاڑنے اور انھیں تہ و بالا کرنے کی۔

شکست خوردہ انداز فکر

ان کے بعد ان لوگوں کا نام اور مقام آتا ہے، جن کی حالت کسی قدر غنیمت تھی۔ یہ تھے غلط

تاویلیں کرنے والے یا شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے افراد، یہ لوگ اسلام کو ٹھکراتے نہیں تھے، نہ اسے ناپسند کرتے تھے، لیکن ذہنی طور پر وہ اس بیرونی تہذیب کے دباؤ میں تھے، اور شعوری طور پر اس کی برتری اور اس کی غیر معمولی طاقت کے قائل تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس تہذیب کے معاملے میں ذہنی شکست کا شکار ہوجاتے تھے۔ چاہے انھیں اس کا احساس رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

یہی وجہ تھی، وہ ان حالات کی خوش نما تاویل کرتے، جو اس تہذیب کے پیدا کردہ تھے۔ وہ انھیں شرعی لبادہ پہنانے کی کوشش کرتے ایسے فتوے اور ایسے بیانات جاری کر کے، نیز ایسے مقالات لکھنے پر مغز ماری کرتے، جو اسلامی نقطہ نظر سے ان کے باقی رہنے کا کوئی جواز پیدا کرسکیں۔

اُنھوں نے فتویٰ دیا کہ ''سود جائز ہے، اگر وہ أَضْعَافاً مُضَاعَفَةً یعنی چند در چند نہ ہو۔ یا وہ ذاتی استعمال کے بجائے کاروباری ضرورتوں کے لیے ہو''۔

اُنھوں نے طلاق اور تعدد ازواج کی اجازت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ حجاب ونقاب جو مسلم خاتون کا شعار اور اس کی زینت ہے، اسے اس کے جسم سے اُتارنے، بے حجاب بلکہ عریاں کر کے مکمل طور سے مغربی خاتون کی نقالی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

اُنھوں نے مسلم اُمت کے اندر سے جہاد کی روح کو ختم کردینے، اور اسلامی زندگی سے اس کا نام ونشان مٹادینے کی کوشش کی، تاکہ مسلم اُمت کے تمام ناخن جھڑ جائیں، اور تمام دانت گرجائیں، اور وہ ہر حملہ آور کے لیے لقمۂ تر بن کر رہ جائے۔ اس گروہ میں کچھ لوگ تو ایسے تھے، جو مخلص تھے۔ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اجتہاد کیا، اور اس اجتہاد میں ٹھوکریں کھائیں!

کچھ دوسرے لوگوں کا مطمح نظر ریاست وسیاست کے کرتا دھرتا حکام کی خوشنودی تھی۔ وہ ایسے فتوے دیتے اور ایسے بیانات جاری کرتے، جو ان کے حکام کو خوش کردیں، یا بیرون ملک میں بیٹھے ہوئے ان حکام کے جو آقا تھے، ان کی توجہات کو ان کی طرف مائل کرسکیں۔ چنانچہ،

وہ ہر آن اس طرح کے فتوے دینے کے لیے تیار بیٹھے رہتے، جو ان کی ہر طرح کی غلط اور غیر انسانی حرکتوں کے لیے گنجائش نکالیں، اور ان کا راستہ صاف کرتے رہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو تھوڑی سی دنیوی منفعت کے لیے اپنے دین دھرم کا سودا کرنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے، اور ذرا ذرا سے فائدے کے لیے اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے۔

مدافعانہ اور معذرت خواہانہ ذہن

ان سے کچھ غنیمت وہ لوگ تھے، جو معذرت خواہانہ (apologetic) یا دفاعی ذہن رکھتے تھے۔ جن کی سوچ یہ تھی کہ: ''دین اسلام تہمتوں کے کٹہرے میں کھڑا ہے، اس پر الزامات کی لمبی چوڑی فہرست ہے کہ اس نے یہ واجب کر دیا! یہ حرام کر دیا! یہ حلال کر دیا! اس نے یہ قانون بنا دیا، جو عقل مغرب یا مغربیت زدہ عقل مشرق کے لیے نا قابل فہم ہے''۔

وہ اسلامی تعلیمات یا اسلامی شریعت کا انکار نہیں کرتے، اور جو اسلام کے خلاف ہے، اسے صحیح نہیں سمجھتے، لیکن وہ اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے تو ان کا انداز مدافعانہ اور ان کا لہجہ معذرت خواہانہ ہوتا۔ ان کا انداز ایسا ہوتا گویا مغربی تہذیب ہی اصل ہے۔ اور جو کچھ اس کے خلاف، یا اس سے ہٹا ہوا ہے، وہ اصل کے خلاف ہے۔ ہمارے علماء کا کہنا تھا: جو اصل کے مطابق ہو اس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا، اور جو فکر مغرب کے خلاف ہو، وہ اصل کے خلاف ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی تشریح کی جائے، اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، اس کی طرف سے کسی نہ کسی طور سے معذرت کی جائے۔

اس میں شبہہ نہیں، کہ عسکری طور پر مغرب فتح مند رہا، اقتصادی میدان میں وہ سب پر حاوی رہا، سیاسی طور پر وہ سب پر غالب رہا، علم وتمدن کے لحاظ سے اسے سب پر فوقیت حاصل رہی، فکری طور پر وہ ہمارے ملکوں پر چھا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اسے تعظیم وتوقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگے، جبکہ وہ خود اپنی نظروں سے گر گئے، اور اپنے آپ کو پست وحقیر سمجھنے لگے۔

ہم نے اپنے مسلم ملکوں میں کتنے ہی ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے،

یا لوگوں نے انھیں بہت بڑا سمجھ رکھا تھا، وہ فکر مغرب کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ فکر مغرب کے بری طرح اسیر ہو گئے، وہ زندگی بھر فکر مغرب اور تہذیب مغرب کے اسیر رہے، اور اسی حالت میں وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

فتنہ انکارِ حدیث

ان کے دوش بدوش غیر منقسم ہندستان میں منکرین سنت کی بھی ایک تحریک چل رہی تھی۔

ان کا گمان تھا کہ قرآن ان کے لیے کافی ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھ رہے تھے، یا جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے، کہ قرآن سنت کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

وہ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ سنت کتاب اللہ کی تشریح وتوضیح اور اس کی عملی تطبیق ہے۔

یہ لوگ اپنے اس فکر کی اشاعت میں کافی سرگرم تھے۔ ان کی یہ سرگرمی ڈھکی چھپی نہیں تھی، بلکہ صاف نظر آ رہی تھی، جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ ہندوستان میں لوگ اس میں الجھے ہوئے تھے، اور آپس میں اس پر گرما گرم بحثیں کر رہے تھے۔

علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی بحث وجدال کی ان مجلسوں میں حصّہ لیا۔ اپنے مضبوط دلائل سے ان کی کج بحثیوں کا ناطقہ بند کر دیا، اور ان کے دلائل کی دھجیاں اڑا دیں۔ ان کے لیے کوئی دلیل چھوڑی نہیں، جس کا وہ سہارا لے سکیں۔

قادیانی تحریک

ان سب سے بدتر وہ لوگ تھے، جو ختم نبوت کے بعد ایک نئی نبوت کے پیرو تھے۔ اس نئی نبوت نے ان کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کو منسوخ کر دیا۔ اور کافر سامراجیوں کی اطاعت کو شرعی طور پر جائز قرار دیا۔

علامہ محمد اقبال [م:۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء] نے صحیح کہا تھا، جب اس دعوت یا اس تحریک کے بارے میں کہا تھا: یہ نبوت محمدی سے بغاوت ہے!

یہ تھے قادیانی لوگ، جن کی سرگرمیاں ہر طرف محسوس کی جا رہی تھیں، جن کے پرچم ہر طرف لہرا رہے تھے، جن کی آوازیں ہر طرف سنی جا رہی تھیں، ان کی کتابوں، ان کے خبر ناموں، ان کے رسالوں، اور ان کے لیکچرز کے ہر طرف چرچے تھے۔ یہ برطانوی سامراجیت کی گود میں پلے تھے، ان کی نگرانی و سرپرستی میں جوان ہوئے تھے، اور انھی کے ہتھیاروں کے زیر سایہ سرگرم عمل تھے۔

سیّد مودودی اور اُن کا فکری ظہور

پوری فضا تناقضات سے بھری ہوئی تھی، اور پورا ماحول کش مکش کی چنگاریوں سے سلگ رہا تھا، اس سلگتے ہوئے ماحول کے دھوئیں سے کوئی بھی ذہن محفوظ نہیں تھا، حتیٰ کہ شاعر اسلام اور مفکر اُمت ڈاکٹر محمد اقبال کا فکر بھی اس دھند سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام اور اُمت اسلام کے دشمن کمال اتاترک کا قصیدہ پڑھنے لگتے ہیں۔ [۳]

یہ غلطی ان سے شروع شروع میں ہوئی، لیکن جلد ہی انھیں اس غلطی کا احساس ہو گیا۔ جب اس کے ناپاک عزائم سامنے آ گئے، تو انھوں نے کھل کر اس کی مذمت کی، اور اسے اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا۔

مصطفیٰ کمال اتاترک [۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء] نے جب ترکی رسم الخط کو بدلنے کا ارادہ کر لیا اور عربی رسم الخط سے ہٹا کر لاطینی رسم الخط رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا، تو ڈاکٹر محمد اقبال نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے کہا:

یہ لادینیت اور لاطینیت کے نام پر تم کن اندھیری وادیوں میں بھٹک رہے ہو؟

اسی طرح 'مشرق' کے عنوان سے کچھ اشعار میں وہ فرماتے ہیں:

مشرق کی روح اپنے جسم کی تلاش میں ہے۔ اس روح کی آب و تاب مصطفیٰ اتاترک یا

۳۔ یہ قصیدہ علامہ محمد اقبال نے جولائی ۱۹۲۲ء میں کہا تھا، اس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

اُمّتے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ اُو
واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بودست
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم

ہمارے نبی کریم ﷺ اُمّی تھے، مگر اُن کی حکمت (دانائی) کے اثر سے ہم تقدیر کے نہاں خانے کے راز سے باخبر ہوگئے۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اُس شرر کے مانند تھے، جس کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ آپ ﷺ نے ہم پر ایک نظر ڈالی، تو ہم آفتاب عالم تاب ہوگئے۔ (ترجمہ: میاں عبدالرشید)
پیام مشرق، قصیدہ بعنوان: خطاب بہ مصطفٰے کمال پاشا ایدہ اللہ

رضا شاہ پہلوی کے ہاتھ میں نہیں۔[۴]

اُنھوں نے مسلم خواتین کو ہوشیار کیا کہ وہ بے حیائی اور اباحیت پسندی میں کمال اتاترک کا ساتھ نہ دیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال کا موقف بہت حد تک امیرالشعراء احمد شوقی [۱۸۶۸ء-۱۹۳۲ء] کے موقف سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے بھی شروع میں کمال اتاترک کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

الله اکبر کم فی الفتح من عجب
یا خالد الترک جدّد خالد العرب

اللہ اکبر، یہ فتح کتنی تعجب خیز ہے۔ اے ترکوں کے خالد، عرب کے خالد کے کارنامے پھر سے دہراؤ!

مگر جب عثمانی خلافت کا سقوط ہوگیا، تو اس طور سے اس کا مرثیہ پڑھا:

عادت أغانی العرس رجع نواح
ونعیت بین معالم الأفراح

كفنت في ليل الزفاف بثوبه

ودفنت عند تبلج الاصباح

شادی کے نغمے شور ماتم میں تبدیل ہو گئے، خوشیوں کے ماحول میں تمھاری خبر مرگ سنائی گئی، شادی کی رات میں شادی کے ہی جوڑے تمھارا کفن بن گئے۔ اور صبح طلوع ہوئی، تو صبح کے اجالے میں تو زمین میں دفن کر دی گئی!

۴۔ اقبال کا شعر اس طرح ہے:

نہ مصطفٰی نہ رضا شاہ میں نمود اس کی

کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

ضرب کلیم، مشرق: ۱۴۰ (مترجم)

فکر مودودی کی نمایاں خصوصیات

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت خاص تھی کہ ان حالات اور اس ماحول میں مولانا مودودی اپنے خالص تجدیدی فکر کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ انھوں نے اسلام کو ویسا ہی پیش کیا، جیسا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے آیا تھا، نہ کہ اس طرح جس طرح لوگ چاہتے ہیں، یا غلطی سے جیسا سمجھتے ہیں۔

اسلام، جیسا کہ وہ ہے، اور جیسا اس کا مزاج ہے، یہاں نہ تاویل کی موشگافی ہے، نہ اس کی کوئی وکالت ہے، نہ کسی ایسے حکم پر معذرت خواہی ہے، جو وحی کے ذریعے سے آیا ہے، اور اس کے جزو اسلام ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

وہ عقل اور وحی کے درمیان کوئی جنگ نہیں چھیڑتے، بلکہ عقل کو وحی کا خادم اور اس کا پاسبان بنا دیتے ہیں۔ اس طور سے کہ عقل اسے سمجھتی، اس کی توضیح وتشریح کرتی، اور اس کی حکمتوں کو آشکارا کرتی ہے۔

۱۔ خالص اور کامل اسلام

اسلام، جس کی تجدید کے لیے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے کمر کس لی تھی، وہ مختلف مسالک

کے جمود پسند مقلدین کا اسلام نہیں تھا، جو اجتہاد اور تجدید کے سرے سے مخالف تھے، جنھیں یہ غلط فہمی تھی، کہ علم بس ان کے مسلک کے علماء متاخرین کی کتابوں میں ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ نا قابل قبول ہے۔

مولانا مودودی جس اسلام پر ایمان رکھتے تھے، وہ فقہی مذاہب کے حریفوں کے اسلام سے بھی مشابہ نہیں تھا، جنھوں نے ان مذاہب کو سرے سے ٹھکرا دیا، اور وہ کچھ ظاہری شکلوں، اور حرفی و لفظی بحثوں میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کے ذہن مقاصد شریعت کو سمجھنے، اور روح اسلام کا ادراک کرنے سے قاصر رہے۔ انھی لوگوں کا نام میں نے رکھا ہے، نئے دور کے 'اصحابِ ظاہر'، جنھوں نے آج شریعت کے کلی مقاصد اور جزئی نصوص کے درمیان جنگ چھیڑ رکھی ہے۔

مولانا مودودی جس اسلام پر ایمان و ایقان رکھتے تھے، وہ اُن کے حریفوں کے اسلام جیسا بھی نہیں تھا، میرا اشارہ ان خرافی لوگوں کی طرف ہے جو بھٹکے ہوئے گمراہ تصوف کے پیرو تھے، جنھوں نے اسلامی عقیدے میں بہت سی خرافات داخل کر دیں، عبادات میں بہت سی بدعات شامل کر دیں، اور فکر و سلوک کی روح نکال دی، ایسی منفی تربیت کے ذریعے جو پیر کے سامنے مرید کی وہی حالت کر دیتی ہے، جو حالت ہوتی ہے مردے کی غسل دینے والے کے سامنے۔

مولانا مودودی کا اسلام تجدد پسندوں [modernists] کے اسلام جیسا بھی نہیں تھا، وہ تجدد پسند جو مغربی تہذیب کے پرستار اور مغربی فکر کے غلام تھے، جنھوں نے مکہ معظّمہ کو چھوڑ کر یورپ کو اپنا قبلہ بنالیا، اور جو اس بات کے خواہاں تھے کہ اسلام کو مغربی تہذیب کا ایک بے وزن ضمیمہ [supplement] بنا کر رکھ دیں۔

مولانا مودودی، جس اسلام کی طرف وہ دعوت دیتے تھے، وہ خالص اسلام تھا، جو کسی شرکت کا روادار نہیں تھا، اس میں کسی طرح کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

اُنھوں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس میں اشتراکیت، یا جمہوریت یا قومیت کا پیوند لگایا جائے، کیونکہ ان تمام نظریات کا قبلہ الگ ہے، ان کے تقاضے اور ان کے مقاصد الگ ہیں،

اور اسی کے لحاظ سے ان کے وسائل بھی الگ ہیں۔

رہا اسلام، تو اس سے کسی کا جوڑ نہیں، وہ ان سب سے قدیم ہے۔ اپنے پیغام، اپنے اہداف، اور اپنے وسائل کے لحاظ سے وہ ان سب سے منفرد، اور ان سب سے ممتاز ہے۔

یہ سارے نظریات انسان کی کوتاہ علمی، کوتاہ فہمی اور پست خواہشات کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ اسلام اللہ تعالیٰ کے کمال اور اس کے عدل کی نمائندگی کرتا ہے:

صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ أَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً (البقرۃ ۲:۱۳۸) اللہ کے رنگ میں رنگ جاؤ، اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہوگا؟

مولانا مودودی کا اسلام کامل وشامل تھا۔ وہ بس عقیدے تک محدود نہیں تھا، اگرچہ عقیدہ ہی اس قلعہ کی اساس تھا، اور وہی ان کے سیاسی اور غیر سیاسی نظریات کی اصل تھا۔

ان کا اسلام عبادات کے دائرے میں بھی محدود نہ تھا، بلکہ ان کے نزدیک پورا دین عبادت تھا، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ [۲۲ رجنوری ۱۲۶۳ء-۲۶ رستمبر ۱۳۲۸ء] ان سے پہلے یہی بات کہہ گئے ہیں۔

اِن کی نگاہ صرف اخلاق پر ہی نہیں ٹھیری، باوجود یہ کہ دین میں اخلاق کا زبردست مقام ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا بُعِثۡتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الۡأَخۡلَاقِ [مسند احمد]
میں تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔

مولانا مودودی کے نزدیک اسلام زندگی کا کامل نظام ہے۔ وہ عبادات کا نظام بھی ہے، اخلاق کا نظام بھی ہے، اجتماعی نظام بھی ہے، معاشی نظام بھی ہے، اور سیاسی نظام بھی ہے۔ اپنے رسائل اور اپنی کتابوں میں انھوں نے اس کی اچھی طرح وضاحت کردی ہے۔ ان کی ایک کتاب بھی ہے: اسلام کا نظام حیات۔

فکر مودودی کی یہ پہلی خصوصیت ہے، انھوں نے اسلام کے باب میں کبھی سودے بازی نہیں کی، اس کے کسی حصّے سے تنازل نہیں اختیار کیا، وہ ہمیشہ اسلام کامل وخالص کو حرز جاں بنائے رہے۔

۲۔عصری بصیرت یا زمانہ شناسی

فکر مودودی کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اگر وہ ایک آنکھ سے اسلام کو دیکھ رہے ہوتے تھے، تو دوسری آنکھ سے زمانے کو دیکھ رہے ہوتے تھے۔ وہ حالات حاضرہ سے کٹ کر ماضی کے تہ خانوں میں جینے کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ وہ موجودہ اہل دانش سے انھی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے، اسی کی منطق سے اس سے مناظرہ کرتے تھے، اور اس کے فکری اور علمی مسلمات سے ہی اس پر وار کرتے تھے۔

ایک کامیاب داعی کا یہی انداز ہوا کرتا ہے، جو اس آیت کریمہ میں لفظ 'بیان' کے مفہوم کو بخوبی سمجھتا ہے:

وَمَاأَرْسَلْنَامِنرَّسُولٍإِلاَّبِلِسَانِقَوْمِهِلِيُبَيِّنَ۔ (ابراہیم ۱۴: ۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں، تاکہ وہ انھیں اچھی طرح سمجھا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے سیّد مودودی کو اصول سازی اور انھی جیسے مسائل پر قیاس کرنے کی غیر معمولی صلاحیت دی تھی۔ چنانچہ وہ موتی کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پروکر ایک ہار تیار کردیتے تھے۔ وہ جزئیات کو کلیات، اور فروع کو اصول سے جوڑنے کی ایسی قدرت رکھتے تھے کہ اس سے وہ اسلام کی بنیادی کو مستنبط (apply) کرسکیں، جسے 'اسلامی نظریہ' کا نام دیا جاتا ہے۔

جو شخص بھی مولانا مودودی کی کتابوں، ان کے رسائل اور ان کے خطبات کا مطالعہ کرے گا، وہ واضح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ اس شخص کی زندگی اپنے زمانے کے ہم رکاب تھی، وہ زمانے کی مشکلات سے پوری طرح آگاہ تھا، معاشرے کے اندر جن افکار ونظریات کا چرچا ہوتا،

ان سے وہ باخبر تھا، نئ تہذیب جو عالم اسلام پر حملہ آور ہوئی، اور اپنی ایجادات سے اس نے نئ نسلوں کو مسحور کر دیا، اس کا سارا کچا چٹھا اس کی نگاہوں میں تھا، اس کی ظاہری چمک دمک کے پیچھے جو گندی ذہنیت چھپی ہوئی تھی، اس سے وہ ناواقف نہیں تھا۔

اس نے اس تہذیب کے بنیادی لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس تہذیب کی جو فکری، نظری اور معنوی بنیادیں تھیں، ان کا اسے ادراک تھا۔ وہ اس تہذیب کی خصوصیات کو بھی سمجھتا تھا، اور اس کی بیماریوں اور آفتوں کا بھی شناسا تھا۔

ظاہر کی چمک دمک اسے باطن کی تاریکیوں سے، ٹائٹل کی خوبصورتی اسے مضامین کی گندگی سے، اور درودیوار کی آب وتاب اسے پس دیوار پلنے والے فتنوں سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔

۳۔ براہ راست معرکہ

مولانا مودودی نے اسلام کے سلسلے میں معذرت خواہانہ انداز نہیں اختیار کیا، نہ ان وکیلوں کا انداز اختیار کیا، جنھوں نے یہ گمان کیا کہ اسلام تہمتوں کے کٹہرے میں کھڑا ہے، پھر مغربی تہذیب اور اس کے لبرل اور اشتراکی علم برداروں کے جارحانہ حملوں کے جواب میں اسلام کی طرف سے مدافعت کی پوزیشن اختیار کر لی۔

جی ہاں، مولانا مودودی نے بیرونی تہذیب، خارجی افکار اور گمراہ نظریات کے مقابلے میں کبھی معذرت خواہی یا مدافعت کی پوزیشن نہیں اختیار کی، بلکہ ہمیشہ وہ دوبدو حملے اور مقابلے کی پوزیشن میں رہے۔

یہ بڑا بت جس سے بہت سے لوگ ہیبت زدہ ہو گئے تھے، اور بہت سے لوگ اس کے آگے سجدے میں گر گئے تھے، اس بڑے بت سے مولانا مودودی کبھی نہیں گھبرائے تھے۔ اس بڑے بت سے مراد وہ مغربی تہذیب ہے، جو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کی بلندیوں کو چھو رہی تھی، اور لوگوں کے دل ودماغ کو بری طرح مرعوب اور مبہوت کیے ہوئے تھی۔

مگر مولانا مودودی کو اسلام پر ناز تھا۔ ناز نہیں، انتہا سے زیادہ ناز تھا۔ انھیں اپنے دین کی برتری پر ایمان تھا، ایمان ہی نہیں پکا ایمان تھا۔

ان کے ایمان کی بنیاد یہ تھی کہ مخلوق کا بنایا ہوا نظام، جو ان کی سفلی خواہشات اور بشری کمزوریوں سے پاک نہیں ہوسکتا، وہ کبھی خالق کے بنائے ہوئے نظام کی بلندیوں کو نہیں چھوسکتا۔ وہ خالق جس کی محبتیں ساری مخلوقات کے لیے عام ہیں، اور جس کا علم ہر شئے کو محیط ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الملک ۶۷: ۱۴)

کیا وہی نہ جانے گا، جس نے پیدا کیا ہے؟ حالانکہ وہ بہت باریک بین اور باخبر ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، مولانا مودودی مغربی تہذیب کی خامیوں اور کمزوریوں سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں اس کا بھی اندازہ تھا کہ دین اسلام سے کہاں کہاں اس کا ٹکراؤ ہے۔ لہٰذا، کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر انھوں نے اس تہذیب پر تابڑ توڑ حملے کیے، اور اس طرح علمی انداز میں اس پر تنقیدیں کیں کہ اس کا سارا کچا چٹھا سامنے آ گیا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ جو لوگ اس عظیم الشان کام کے لیے آگے بڑھے، جنھوں نے مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلام پر مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کی جدوجہد کی، ان میں مولانا مودودی سب سے آگے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں یہ مورچہ سنبھالنے کی اہلیت رکھتے تھے اور اُنھوں نے اسے سنبھالا بھی۔

سیّد مودودی نے مغربی تہذیب کے سماجی پہلو، یا سماجی حالت پر زبردست تنقید کی، اس کے لیے انھوں نے کتاب پردہ لکھی، اس میں انھوں نے اسلام کے نظریۂ حجاب اور نظریۂ عفت وعصمت کی وضاحت کی، عورت کا کیا کام اور کیا مقام ہے، اور ایک اچھے خاندان کی کیا صفات ہوتی ہیں، جو اسے مغربی تہذیب سے ممتاز کرتی ہیں، ان سارے پہلوؤں کو مدلل انداز سے پیش کیا۔

سیّد مودودی نے مغربی تہذیب کے معاشی نظام پر بھی زبردست تنقید کی۔ اس کے لیے

سود نامی کتاب لکھی۔ اس میں سودی نظام، جو سرمایہ دارانہ نظام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس پر پورا مغربی تمدن قائم ہے، اس کو زوردار طریقے سے مسترد کیا۔ اور اسلام نے سود کو جو حرام قرار دیا ہے، اور سودی نظام کے خلاف اللہ ورسول کی طرف سے جو جنگ کا اعلان کیا ہے، اس کی حکمتیں بیان کیں۔

اسی طرح اسلامی نظام معیشت کی کیا خوبیاں ہیں، اسلام نے کتنی آسانی سے اس سلسلے کی تمام پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے، ایک اچھی معیشت کے لیے اس نے کتنے عادلانہ قوانین دیے ہیں، ان تمام باتوں کی وضاحت کے لیے انھوں نے دو کتابچے لکھے:

ایک کتابچہ ہے: جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل، اور دوسری کتاب ہے: اسلام اور جدید معاشی نظریات۔ [5]

اسی طرح مولانا مودودی نے مغربی تہذیب کے سیاسی نظام پر بھی زبردست مگر مدلل تنقید کی، گرچہ بہت سے لوگوں کے نزدیک مغربی تہذیب کا سب سے اچھا پہلو یہی ہے، کیونکہ اس نے اپنے سیاسی نظام میں فرد کو بہت سی آزادیاں دی ہیں، اور بہت سے حقوق کی اس نے حمایت کی ہے۔

تاہم، اس تنقیدی یا احتسابی عمل میں مولانا مودودی کہیں کہیں راہِ اعتدال سے ہٹ گئے۔

اُمت مسلمہ کے تشخص کی حفاظت، اسلامی تہذیب کی خصوصیات کی حفاظت، اسلامی آداب اور اسلامی قدروں کی حفاظت کے جوش میں وہ اس بیرونی تہذیب کے معاملے میں تشدد کا رویہ اختیار کر بیٹھے، اس سلسلے میں کسی طرح کی نرمی کے وہ روادار نہ ہوئے، جیسا کہ دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔

معاشرتی پہلو سے دیکھیں، تو وہ پردے میں عورتوں کے لیے چہرہ ڈھانپنا واجب قرار دیتے ہیں، وہ سینے اور کندھے پر دوپٹہ ڈال لینا کافی نہیں سمجھتے، بلکہ چہرے کو ڈھانپنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ [6]

معاشی نظام کے سلسلے میں عدل اجتماعی اور اشتراکی رجحان کے تعلق سے جو جدید خیالات اور جدید نقطہ ہائے نظر ہیں، ان کو انھوں نے قبول نہیں کیا، جیسا کہ شیخ مصطفیٰ سباعی [۱۹۱۵ء-۱۹۶۴ء]

نے اپنی کتاب اشتراکیة الاسلام اور شیخ محمد غزالی [۱۹۱۷ء-۱۹۹۶ء] نے اپنی کتاب الاسلام والمناہج الاشتراکیة میں کیا ہے۔

سیاسی نظام کے سلسلے میں اُنھوں نے جمہوریت پر نہایت کڑی تنقید کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اس کی فکری بنیادوں کو سامنے رکھا کہ: ''موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت، یعنی ایک علاقے کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختار مطلق

۵۔ یہ دونوں آثار مولانا مودودی کی کتاب 'معاشیات اسلام' (مرتبہ: پروفیسر خورشید احمد) میں شامل ہیں، ناشر: اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، مارچ ۱۹۶۹ء

۶۔ پردہ: ناشر: اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، جون ۲۰۶۲ء

ہونا، اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کے تابع ہونا''۔[۷]

اُنھوں نے اس کو اس نظر سے نہیں دیکھا، جس نظر سے ہم نے دیکھا۔ حکمرانوں کے چناؤ، حکمرانوں کے احتساب، بوقت ضرورت ان کی برطرفی، اہل حل وعقد یا عوامی نمائندوں کے چناؤ کے سلسلے میں جمہوری نظام کی ترتیب اور طریق کار کو ہم اپناتے ہیں اور ان کی تائید کرتے ہیں۔ اور جمہوریت کو فرد کی حکومت کے بجائے عوام کی حکومت سمجھتے ہیں۔

جمہوری نظام یا ڈیموکریسی کی روح ہی یہ ہے کہ اقتدار عوام کے ہاتھ میں رہے، نہ کہ حکومت کے۔ اور مسلم معاشرے میں جو جمہوری نظام ہوگا، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگا کہ اس میں بالادستی شریعت کی ہوگی۔

امام مودودی نے بھی اپنی جماعت کے لیے انتخابات کا یہی طریقہ پسند کیا تھا، جیسا کہ ان کے رفقائے کار کا بیان ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ میں جماعت اسلامی کے ارکان کا (کل پاکستان) اجتماع ہوا تھا، اس اجتماع کا خاص موضوع یہی تھا کہ ملکی انتخابات میں حصّہ لیا جائے یا نہیں؟ اس موقع پر انتخابات میں حصّہ لینے کی تائید میں مولانا مودودی نے نہایت مفصل اور طویل خطاب کیا تھا، جو کئی گھنٹے جاری رہا۔ پھر مسلسل تین دنوں تک اس پر مذاکرہ اور تبصرہ ہوتا رہا۔

اس وقت ارکان جماعت کی مجموعی تعداد ۹۳۵ تھی، ان میں سے ۹۲۰ ارکان نے مولانا مودودی کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا، اور عملی طور پر ملکی انتخابات میں حصّہ لینے کی تائید کی، جبکہ پندرہ ارکان نے، جو جماعت کے اکابرین میں سے تھے، اس فیصلے سے برأت کا اعلان کیا، اور پھر جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اس کے بعد مولانا مودودی اور ان کی جماعت نے ان جمہوری انتخابات میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ اس سے قبل وہ پاکستان میں 'قرارداد مقاصد' کی تحریک چلا چکے تھے، جس میں پاکستان کے بیشتر علماء نے ان کا ساتھ دیا۔ پھر اسے پاکستان کی پارلیمنٹ نے بھی [مارچ ۱۹۴۹ء میں]

۷۔ ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، ستمبر ۱۹۴۸ء

پاس کر دیا، اور وہ ملکی دستور کا حصّہ بن گئی۔ اس کی بنیاد پر قرآن وسنت کو 'اسلامیہ جمہوریہ پاکستان' کا مصدرِ قانون قرار دیا گیا۔ اب وہاں کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جا سکتا، جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے ٹکراتا ہو۔

علامہ مودودی نے مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے ان بنیادی نکات کی نشان دہی کر دی ہے، جن میں مغربی تہذیب ہماری اسلامی تہذیب سے ٹکراتی ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ سیکولرزم، ۲۔ نیشنلزم، ۳۔ ڈیموکریسی

❖❖❖

مولانا مودودی: مصلح اور داعی انقلاب

ہر مفکر مصلح نہیں ہوا کرتا۔ بہت سے مفکرین ایسے ہوتے ہیں، جن پر خالص علمی تحقیق ذوق کا غلبہ رہتا ہے، نظریات یا کلامی بحثوں میں ان کا انہماک ہوتا ہے۔ معاشرے اور اس کی اصلاح سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

اصلاحی فکر وہی ہے جسے معاشرے اور اس کے مسائل سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی میں سماجی اور معاشرتی بیماریوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ بیماریوں کی جڑیں کہاں ہیں، اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔

مفکر مصلح فی الواقع ایک سماجی طبیب ہوتا ہے۔ اس کی بصیرت افروز نگاہیں اُمت کی بیماریوں کی اصل تک پہنچ جاتی ہیں۔

وہ بیماری کے ظاہری آثار کو دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ گہرائی میں جاکر بیماری کے اسباب کا سراغ لگاتا ہے، اور جب اصل بیماری کا سراغ لگ جاتا ہے، تو اس کا علاج مرہم یا لیپ یا اس طرح کی وقتی دواؤں تک محدود نہیں رہتا، جو اوپر کی جلد ٹھیک کردیں، اور اندرونی جراثیم کا قلع قمع نہ کریں۔ وہ ایسی مسکّن دوائیں نہیں تجویز کرتا، جو تھوڑی دیر کے لیے مریض کی تکلیف کم کردیں، اور بیماری کو جڑ سے نہ اکھاڑ دیں۔

مولانا مودودی مسلم اُمت کے لیے ایک ماہر طبیب کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کی اصل بیماری کا سراغ لگایا، بیماری کے اصل جراثیم کا پتہ چلایا، اور ایک ہی لفظ میں اسے دوٹوک انداز میں بیان کردیا، اور وہ ہے: ''جاہلیت''۔

ان کی نظر میں یہ بیماری خالی اُمت مسلمہ کی بیماری نہیں، بلکہ یہ پوری انسانی دُنیا کی بیماری ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں اس کے لیے عذاب جاں بنی رہی۔ رسولوں کی بعثت کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا کہ وہ اس کے جراثیم کا جڑ سے خاتمہ کر دیں۔

چاہے یہ جاہلیت انکار والحاد کی جاہلیت ہو، اور یہی اصل جاہلیت ہے، یا وہ شرک و بدعت کی جاہلیت ہو، جو پہلی جاہلیت سے کسی بھی درجہ کم نہیں، اور عموماً رسولوں کی بعثت اسی جاہلیت کی جڑیں کاٹنے کے لیے ہوتی رہی، یا وہ رہبانیت اور ترک دُنیا کی جاہلیت ہو۔

مولانا مودودی نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ: ''اسلام جو تمام انبیاء کا دین ہے، اس کے اور جاہلیت کے مابین ہمیشہ سے کش مکش رہی ہے۔ کش مکش کی یہ آگ ہمیشہ بھڑکتی رہی ہے، اور ہمیشہ بھڑکتی رہے گی۔''

یہاں ''جاہلیت'' سے مراد کوئی متعین جاہلیت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد نفس جاہلیت ہے، چاہے وہ کسی بھی رنگ اور کسی بھی شکل میں ہو، اور حقیقی مجدد کا کام یہ ہے کہ وہ قیادت کی باگ ڈور جاہلیت کے ہاتھوں سے چھین لے۔

''جاہلیت'' کسی متعین زمانے کا نام نہیں، جو اسلام کے آنے سے ختم ہو گیا، جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ جاہلیت تو نام ہے کچھ خاص نظریات، کچھ خاص رجحانات، اور اک مخصوص طرز حیات کا۔ جب بھی یہ چیزیں پائی جائیں گی، جاہلیت ان کے ہم رکاب ہوگی، اور پہچان لی جائے گی، چاہے وہ کتنے ہی خوبصورت لباس میں ہو۔ جاہلیت کی نمایاں علامت ہوتی ہے، اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور اس کی پسندیدہ شریعت سے دوری!

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (المائدۃ ۵:۵۰)

کیا یہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہوں؟[۸]

۸۔ اسلام اور جاہلیت، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۶۲ء

مولانا مودودی کی اصلاحی فکر کچھ جزوی اصلاحات کا پیوند لگانے والی فکر نہیں تھی، کہ باہر سے درآمد کیا ہوا جاہلی نظام جوں کا توں باقی رکھا جائے، بس اس میں کچھ تھوڑی سی جزوی اصلاحات کردی جائیں، جو اس کی شدت کو کچھ ہلکا کردیں، اور بظاہر اسے اسلام سے کچھ قریب کردیں، اور اس طرح اُمت مسلمہ کو حیرانی وسرگشتگی کے چوراہے پر لاکر چھوڑ دیں!

ہرگز نہیں، مولانا مودودی ''جاہلیت'' کے ساتھ صلح پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے، کبھی انھوں نے دین وشریعت کے کسی جزء سے تنازل نہیں اختیار کیا، کبھی بھی انھوں نے جاہلیت سے کہیں راستے میں ملنا گوارا نہیں کیا۔

اس کے برعکس ان کے فکر کا ہدف تھا کلی اور ہمہ جہتی انقلاب۔ ایسا انقلاب جو زمین کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی جڑوں سے شروع ہوکر فضا میں پھیلی ہوئی شاخوں تک پہنچے۔

ان کی منشا یہ تھی کہ قوانین اور ضابطوں کو بدلنے سے پہلے جاہلیت کا فکر وفلسفہ، اور اس کی قدریں اور پیمانے بدل جائیں۔

جی ہاں، ان کی اصلاحی فکر ایک انقلابی فکر تھی۔ ان کے پیش نظر تھا کہ پورا معاشرہ اپنی بنیادوں سمیت بدل جائے۔

وہ چاہتے تھے کہ جاہلیت کے قلعوں کی بنیادیں ہل جائیں، اور ان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، تاکہ ان کے کھنڈرات پر مکمل اسلامی زندگی کی تعمیر کی جائے۔ ایسی زندگی جو فکری طور پر اسلامی اصولوں کی پابند ہو، جس کی روح اسلامی عبادات سے چمک رہی ہو، جس پر مکمل طور سے اسلامی شریعت کی حکمرانی ہو، جس کے جذبات کو متحرک کرنے والی چیز اسلام کی دعوت اور اسلام کے شعائر ہوں، اور جس کے طور طریق اسلامی اخلاق، اسلامی آداب اور اسلامی قدروں کے آئینہ دار ہوں۔

ان کا مشہور خطبہ ہے: 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ؟' جو بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اواخر میں عربی زبان میں منتقل کیا گیا تھا۔

فکرِ مودودی کا تحریکی پہلو

مولانا مودودی کی ایک اور اُمتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوئی اکیڈمک مفکر نہیں تھے، نہ وہ کوئی ایسے نظریاتی مصلح تھے جو کسی دور دراز قلعے میں یا الگ تھلگ خانقاہ میں مقیم ہوں، جو اپنے اصلاحی فکر کو صفحۂ قرطاس کے حوالے کردے، پھر اس کے بعد کسی قسم کی ذمہ داری نہ اٹھائے، جیسا کہ لبنانی روزنامہ ''الحیاۃ'' کے بانی پروفیسر کامل مروۃ نے کہا تھا ''اپنی بات کہو اور آگے بڑھ جاؤ!''[9]

مولانا مودودی کے یہاں ان کے عظیم فکری پیغام کے ساتھ ساتھ ایک عظیم عملی پیغام بھی تھا، جو فکری پیغام سے کم اہم نہ تھا، وہ یہ کہ اپنے فکر کو وہ ایک تحریک کی شکل دے دیں، ایک مثبت اور تعمیری تحریک کی شکل، جو کتابوں اور کتابچوں کی تیاری کے بعد افراد کی تیاری کا کام بھی کرے۔ صحیح فکر، لوگوں سے اپنے آپ کو منوا نہیں سکتا محض اس بنیاد پر کہ وہ صحیح فکر ہے، بلکہ وہ اس فکر کے ماننے والوں، اس کے سرگرم کارکنان، اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کے تعاون سے ہی غلبہ حاصل کرتا ہے، عربی شاعر نے کہا تھا:[10]

وعادة السیف أن یزهی بجوهره

ولیس یعمل الا فی یدی بطل

تلوار اپنے آب و تاب پر نازاں ہوتی ہے، مگر وہ کام کی اسی وقت ہوتی ہے، جب وہ کسی بہادر کے ہاتھوں میں ہو۔

قرآن مجید بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اللہ رب العزت اپنے رسول کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

۹۔ روزنامہ 'الحیاۃ' کا پہلا شمارہ ۲۸؍جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۲۵؍صفر ۱۳۶۵ھ بروز دوشنبہ شائع ہوا، اس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا ''اپنی بات کہو اور آگے بڑھ جاؤ!

۱۰۔ طغرائی کے اشعار سے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (الانفال ۸:۶۲)

وہی تو ہے جس نے تمھیں اپنی مدد سے اور مومنین سے تقویت بخشی۔

اس طرح مولانا مودودی نے اگست ۱۹۴۱ء میں ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک تحریک کی بنیاد رکھی، اس تحریک نے اسلام ہی کو اپنا نسب، اپنا ہدف اور اپنا پیغام بنایا۔ اس نے اپنی سرگرمیوں کو ان اصولوں اور ان اہداف تک ہی محدود رکھا جس کی مولانا مودودی نے دعوت دی تھی۔

مولانا مودودی نے دعوت دین کے اصولوں کو بیان کرتے ہوئے، اور اپنے اہداف اور اپنے بنیادی نکات کی وضاحت کرتے ہوئی فرمایا تھا:

اگر ہم اس دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات (Points) پر مشتمل ہوگی:

یہ کہ ہم بندگان خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص، اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے، اُس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کردے اور جب وہ مسلمان ہے، یا بنا ہے، تو مخلص مسلمان بنے۔ اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہوجائے۔

یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق وفجار کی رہنمائی اور قیادت وفرماں روائی میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دُنیا کے نظام کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین وصالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔[۱۱]

آگے مولانا مودودی ان اصولوں یا ان نکات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ

۱۱۔ دعوتِ اسلامی اور اس کا طریقہ کار، ۱۹/اپریل ۱۹۴۵ء، پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع سے خطاب

تینوں نکات اگرچہ اپنی جگہ بالکل صاف ہیں، لیکن ایک مدت دراز سے ان پر غفلتوں اور غلط فہمیوں کے پردے پڑے رہے ہیں۔ اس لیے بدقسمتی سے آج غیر مسلموں کے سامنے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے سامنے بھی ان کی تشریح کرنے کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔

بندگی ربّ سے مراد

اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کو خدا اور اپنے آپ کو خدا کا بندہ تو مان لیا جائے، مگر اس کے بعد اخلاقی و عملی اور اجتماعی زندگی ویسی کی ویسی ہی رہے، جیسی خدا کو نہ ماننے اور اس کی بندگی کا اعتراف نہ کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔

اسی طرح خدا کی بندگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ خدا کو فوق الفطری طریقے پر خالق اور رازق اور معبود تسلیم کر لیا جائے، مگر عملی زندگی کی فرماں روائی و حکمرانی سے اس کو بے دخل کر دیا جائے۔

اسی طرح خدا کی بندگی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور صرف مذہبی زندگی میں جس کا تعلق عقائد اور عبادات اور حرام و حلال کی چند محدود قیود سے سمجھا جاتا ہے، خدا کی بندگی کی جائے۔

باقی رہے دُنیاوی معاملات جو تمدن، معاشرت، سیاست، معیشت، علوم و فنون اور ادب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، تو ان میں انسان خدا کی بندگی سے بالکل آزاد رہے اور جس نظام کو چاہے خود وضع کرے یا دوسروں کے وضع کیے ہوئے کو اختیار کر لے۔

بندگی ربّ کے ان سب مفہومات کو ہم سراسر غلط سمجھتے ہیں، ان کو مٹانا چاہتے ہیں اور ہماری اور ہماری لڑائی جتنی شدت کے ساتھ نظام کفر کے ساتھ ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ

شدت کے ساتھ بندگی کے ان مفہومات کے خلاف ہے، کیونکہ ان کی بدولت دین کا تصور ہی سرے سے مسخ ہوگیا ہے۔

ہمارے نزدیک قرآن اور اس سے پہلے کی تمام آسمانی کتابیں اور محمد ﷺ اور آپ سے پہلے کے تمام پیغمبر جو دُنیا کے مختلف گوشوں میں آئے، ان کی بالاتفاق دعوت جس بندگیٔ رب کی طرف تھی، وہ یہ تھی کہ انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور ربّ، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہنما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے۔

اور اپنی پوری زندگی کو خواہ وہ شخصی (Individual) ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی اور نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کردے۔

یہی مطالبہ ہے جو قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ **اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً** (البقرۃ ۲:۲۰۸) تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔

یعنی اپنی زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے کو بندگی ربّ سے محفوظ (reserve) کر کے نہ رکھو۔ اپنے تمام وجود کے ساتھ، اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کی غلامی واطاعت میں آجاؤ۔ زندگی کے کسی معاملے میں بھی تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہو کہ اپنے آپ کو خدا کی بندگی سے آزاد سمجھو اور اس کی رہنمائی اور ہدایت سے مستغنی ہوکر اور اس کے مقابلے میں خودمختار بن کر، یا کسی خودمختار بنے ہوئے بندے کے پیرو یا مطیع ہوکر وہ راہ چلنے لگو، جس کی ہدایت خود خدا نے نہ دی ہو۔

بندگی کا یہی وہ مفہوم ہے جس کی ہم تبلیغ کرتے ہیں اور جسے قبول کرنے کی سب لوگوں کو، مسلمانوں اور غیرمسلموں سب کو دعوت دیتے ہیں۔

منافقت کا مطلب

دوسری چیز جس کی ہم دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے یا اسلام قبول کرنے والے سب لوگ منافقانہ رویے کو بھی چھوڑیں اور اپنی زندگی کو

تناقضات (inconsistencies) سے بھی پاک کریں۔

منافقانہ رویے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے، اس کے بالکل برخلاف نظامِ زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلط پا کر راضی و مطمئن رہے۔ اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے، بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظامِ زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا رہے یا اگر اس کو بدلنے کی کوشش بھی کرے، تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظامِ زندگی کی جگہ دینِ حق قائم ہو، بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹا کر دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ طرزِ عمل سراسر منافقانہ ہے، اس لیے کہ ہمارا ایک نظامِ زندگی پر ایمان رکھنا اور دوسرے نظامِ زندگی میں راضی رہنا، بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مخلصانہ ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جس طریقِ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں اور ہماری روح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ کے پیش آجانے پر بے چین و مضطرب ہو جائے، جو اس طریقِ زندگی کے مطابق جینے میں سدّ راہ بن رہی ہو۔ ایمان تو ایسی کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا، کجا کہ اس کا پورے کا پورا دین کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو۔

اس دین کے کچھ اجزا پر عمل ہوتا بھی ہو، تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظامِ زندگی نے ان کو بے ضرر سمجھ کر رعایتاً باقی رکھا ہو اور ان رعایات (concessions) کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر، غالب نظامِ زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصولِ موضوعہ کے طور پر تسلیم کر کے سوچے۔

اس قسم کا ایمان چاہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو، لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے اور قرآن کی متعدد آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ حقیقت میں نفاق ہی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ لوگ بھی اپنے آپ کو بندگیٔ ربّ کے اس مفہوم کے مطابق جس کی ابھی تشریح کی ہے، خدائے واحد کی بندگی میں دینے کا اقرار کریں۔ ان کی زندگی اس نفاق سے پاک ہو۔ بندگیٔ حق کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ جو طریق زندگی، قانونِ حیات، جو اصولِ تمدن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظام فکر و عمل اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے، ہماری زندگی کا پورا پورا کاروبار اسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی، اس نظامِ حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔

اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظام باطل کے تسلط کو برداشت کرنا بھی، جب کہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو، تو اس پر راضی و مطمئن رہنا، اس کے قیام و بقا کی سعی میں حصّہ لینا، یا ایک نظامِ باطل کی جگہ دوسرے نظامِ باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے۔

تناقض کی حقیقت

اس نفاق کے بعد دوسری چیز جس کو ہم ہر پرانے اور نئے مسلمان کی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں اور جس کے خارج کرنے کی ہر مدعیٔ ایمان کو دعوت دیتے ہیں وہ 'تناقض' ہے۔ 'تناقض' سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس چیز کا زبان سے دعویٰ کرے، عمل سے اس کی خلاف ورزی کرے۔

یہ بھی تناقض ہے کہ آدمی کا اپنا عمل ایک معاملے میں کچھ ہو اور دوسرے معاملے میں کچھ

اور۔[اس لیے] اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی کو خدا کی بندگی میں دے دیا ہے تو اسے جان بوجھ کر کوئی حرکت بھی ایسی نہ کرنی چاہیے جو بندگیِ رب کی ضد ہو، اور اگر بشری کمزوری کی بنا پر ایسی کوئی حرکت اس سے سرزد ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے پھر بندگیِ رب کی طرف پلٹنا چاہیے۔

ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک اہم مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو، پچرنگی اور چورنگی زندگی تو درکنار، دورنگی زندگی بھی دعویٰ ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔

ایک طرف ہم مسجد میں جا جا کر نمازیں پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے باہر نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں، اپنے لین دین میں، اپنی معاش کی فراہمی میں، اپنی شادی بیاہ میں، اپنی میراثوں کی تقسیم میں، اپنی سیاسی تحریکوں میں اور اپنے سارے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول کر...... کہیں اپنے نفس کے قانون کی، کہیں اپنی برادری کے رواج کی، کہیں اپنی سوسائٹی کے طور طریقوں کی اور کہیں خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کے قوانین کی پیروی میں کام کرنے لگیں۔ ایک طرف ہم اپنے خدا کو بار بار یقین دلائیں کہ: 'ہم تیرے ہی بندے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں' اور دوسری طرف ہر اس بت کی پوجا کریں جس کے ساتھ ہمارے مفاد، ہماری دلچسپیاں اور ہماری محبتیں اور آسائشیں کچھ بھی وابستگی رکھتی ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار تناقضات جو آج مسلمانوں کی زندگی میں پائے جاتے ہیں، جن کے موجود ہونے سے کوئی ایسا شخص جو بینائی رکھتا ہو انکار نہیں کرسکتا۔ ہمارے نزدیک وہ اصلی گھن ہیں جو اُمت مسلمہ کی سیرت واخلاق کو اور اس کے دین وایمان کو اندر ہی اندر کھائے جاتے ہیں، اور آج زندگی کے ہر پہلو میں مسلمانوں سے جن کمزوریوں کا اظہار ہو رہا ہے، ان کی اصل جڑ یہی تناقضات ہیں۔

ایک مدت تک مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جاتا رہا ہے کہ: 'تم شہادت توحید ورسالت زبان سے ادا کرنے اور روزہ ونماز وغیرہ چند مذہبی اعمال کو اختیار کر لینے کے بعد خواہ کتنے ہی غیر دینی اور غیر ایمانی طرزِ عمل اختیار کر جاؤ، بہر حال نہ تمھارے اسلام پر کوئی آنچ آسکتی ہے اور نہ تمھاری نجات کو کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔'

حتیٰ کی اس ڈھیل (allowance) کی حدود اس حد تک بڑھیں کہ نماز روزہ بھی مسلمان ہونے کے لیے شرط نہ رہا اور مسلمانوں میں عام طور پر یہ تخیل پیدا کر دیا گیا کہ اگر ایک طرف ایمان اور اسلام کا اقرار ہو اور دوسری طرف ساری زندگی اس کی ضد ہو، تب بھی کچھ نہیں بگڑتا، لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً [البقرہ ۲:۸۰] دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں، اِلّا یہ کہ چند روز کی سزا مِل جائے تو مِل جائے۔

اسی چیز کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام کے ساتھ ہر فسق، ہر کفر اور ہر معصیت ونافرمانی اور ہر ظلم وسرکشی کا جوڑ آسانی سے لگ جاتا ہے اور مسلمان مشکل ہی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ جن راہوں میں وہ اپنے اوقات، اپنی محنتیں، اپنے مال، اپنی قوتیں اور قابلیتیں اور اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اور جن مقاصد کے پیچھے ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں صرف ہو رہی ہیں، وہ اکثر ان کے ایمان کی ضد ہیں، جس کا وہ دعویٰ رکھتے ہیں۔

ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یکسو ہو، یک رنگ مومن ومسلم ہو۔ ہر اس چیز سے کٹ جائے اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے، جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو اور خوب اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔

قیادت میں تبدیلی کی ضرورت

آگے امام مودودی لکھتے ہیں:

اب ہماری دعوت کے تیسرے نکتے کو لیجیے۔ ابھی جن دو نکات کی تشریح میں آپ کے

سامنے کرچکا ہوں، یہ تیسرا نکتہ اُن سے بالکل ایک منطقی نتیجے کے طور پر نکلتا ہے۔ ہمارا اپنے آپ کو بندگیٔ ربّ کے حوالے کردینا اور اس کی حوالگی وسپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا، بلکہ مخلص ہونا اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کرکے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا، لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں جو آج کفر، دہریت، شرک، فسق وفجور اور بداخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے اور جس کے نقشے بنانے والے مفکرین اور جس کا عملی انتظام کرنے والے مدبّرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کے قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔

جب تک زمام کاران لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی، اور جب تک علوم وفنون، آرٹ اور ادب، تعلیم وتدریس، نشرواشاعت، قانون سازی اور تنفیذِ قانون، مالیات، صنعت وحرفت، تجارت اور ملکی انتظام اور بین الاقوامی تعلقات، ہر چیز کی باگ ڈور یہ لوگ سنبھالے ہوئے رہیں گے۔ کسی شخص کے لیے دُنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا، نہ صرف عملاً محال ہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیرممکن ہے۔

اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو، اس پر منجملہ دوسرے فرائض کے ایک اہم ترین فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دُنیا کے انتظام کو فساد سے پاک کرے۔ اور صلاح پر قائم کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ زمام کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فساق وفجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع دُنیا کے امام وپیشوا اور منتظم رہیں اور پھر دُنیا میں ظلم وفساد، بداخلاقی اور گمراہی کا دور دورہ نہ ہو۔ یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربے ومشاہدے سے کالشّمس فی النہار ثابت ہوچکا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

پس، ہمارا مسلم ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم دُنیا کے ائمہ ضلالت کی پیشوائی ختم

کر دینے اور غلبۂ کفر وشرک کو مٹا کر دینِ حق کو اس کی جگہ قائم کرنے کی سعی کریں۔

امامت میں انقلاب کا راستہ

مگر یہ تغیر محض چاہنے سے نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بہرحال دُنیا کا انتظام چاہتی ہے اور دُنیا کے انتظام کے لیے کچھ صلاحیتیں درکار ہیں، جن کے بغیر کوئی گروہ اس انتظام کو ہاتھ میں لینے اور چلانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

اگر مومنین صالحین کا ایک منظم جتھا ایسا موجود نہ ہو جو انتظام دُنیا کو چلانے کی اہلیت رکھتا ہو، تو پھر مشیت الٰہی غیر مومن اور غیر صالح لوگوں کو اپنی دُنیا کا انتظام سونپ دیتی ہے۔

لیکن اگر کوئی گروہ ایسا موجود ہو جائے جو ایمان بھی رکھتا ہو، صالح بھی ہو اور ان صفات اور صلاحیتوں اور قوتوں میں کفار سے بڑھ جائے، جو دُنیا کا انتظام چلانے کے لیے ضروری ہیں تو مشیت الٰہی نہ ظالم ہے اور نہ فساد پسند کہ پھر بھی اپنی دُنیا کا انتظام فساق وفجار اور کفار ہی کے ہاتھ میں رہنے دے۔

پس، ہماری دعوت صرف اس حد تک نہیں ہے کہ دُنیا کی زمام کار فساق وفجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے، بلکہ ایجاباً (positively) ہماری دعوت یہ ہے کہ اہل ایمان وصلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے، جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ اور نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح وپاکیزہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ ان تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دُنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کردے۔[۱۲]

کتابوں اور افراد کا مؤلف

مولانا مودودی گنتی کی ان چند شخصیات میں سے ہیں، جنھوں نے بہ یک وقت فکر اور تحریک، یا علمی اور تنظیمی ودعوتی دونوں محاذوں پر کام کیا۔

۱۲۔ یہ وہ خطاب ہے جو مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع کے موقعے پر کیا تھا۔ یہ اجتماع اپریل ۱۹۴۵ء کو دارالاسلام، پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا تھا۔ خطاب کا عنوان تھا: دعوت اسلامی اور اس کا طریق کار، یہ اس وقت کا خطاب ہے جب ہندستان تقسیم نہیں ہوا تھا، چنانچہ اس میں متحدہ ہندستان کے جملہ ارکان شریک تھے۔ (دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات، ۱۹۶۲ء، لاہور)

یہ بات کسی صاحب علم سے مخفی نہیں، کہ جو لوگ تحریکی، دعوتی اور سیاسی سرگرمیوں میں لگ جاتے ہیں، وہ بہت ٹھوس (Original) علمی کاموں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے، ایسے لوگوں کا عُذر ہوتا ہے کہ ان کا کام افراد کی تیاری ہے نہ کہ کتابوں کی، اور جب وہ افراد تیار ہو جائیں گے جو مطلوب ہیں، تو وہ افراد وہ تمام کتابیں تیار کر دیں گے، جن کی ضرورت ہے۔

سید جمال الدین افغانی [م: ۸/مارچ ۱۸۹۷ء] بہت کم علمی کام کر سکے، کیونکہ اپنی انقلابی وسیاسی سرگرمیوں اور مسلسل مختلف ممالک کے دوروں کی وجہ سے تصنیف وتالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے، سوائے اس کے جو دہریوں کے ردّ میں تحریر کیا، اور عربی مجلہ 'العروۃ الوثقیٰ' وغیرہ کے لیے جو کچھ تحریر فرمایا۔

ان کے شاگرد اور عزیز دوست امام محمد عبدہ [م: ۱۱/جولائی ۱۹۰۵ء] کا علمی کام بھی زیادہ ہے، اور ان کے یہاں فکری گہرائی اور علمی وسعت بھی ہے۔

اور ان دونوں کے شاگرد امام محمد رشید رضا [م: ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء] نے تو سارے عالم میں اپنے علم کے پرچم لہرائے۔

اسی طرح امام حسن البنا شہید کو دیکھتے ہیں کہ وہ عنفوان شباب سے ہی بھرپور دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے، اس کے باوجود انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ بعض چیزیں کتابچوں کی شکل میں ہیں، بعض مقالات کی شکل میں، بعض بیانات اور محاضرات کی شکل میں ہیں۔

افسوس کی بات ہے، کہ ان کی تمام چیزیں اب تک جمع نہیں کی جاسکیں، اگر چہ پروفیسر جمعہ امین اور ہمارے شاگرد عصام تلیمہ نے بعض چیزوں کی جمع وترتیب کا کام انجام دیا ہے۔

امام حسن البنا شہید کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس بات کا احساس تھا کہ تحریک میں علمی پہلو سے گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اسی کے پیش نظر اُنھوں نے مجلہ'الشہاب' کا اجراء کیا تھا، تاکہ وہ مجلہ'المنار' کا خلا پر کرسکے اور اس سے علمی وفکری تجدید کا کام جاری رہ سکے۔ اس مجلہ کے اکثر بنیادی کالم: تفسیر، اصول حدیث، عقائد، تاریخ، اور اک اجتماعی نظام ہونے کی حیثیت سے اسلام کی بنیادیں وغیرہ وہ خود ہی لکھا کرتے تھے۔

میرا احساس ہے، ویسے غیب کے بارے میں میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا، کہ اگر امام حسن البنا شہید کو مزید زندگی ملی ہوتی تو وہ عظیم علمی ذخیرہ چھوڑ کر جاتے، لیکن اللہ کا متعین کردہ وقت آجاتا ہے تو اس کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ امام مودودی نے بیک وقت افراد کی بھی تالیف کی اور کتابوں کی بھی۔ دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا علمی وفکری کام متاثر نہیں ہوا، چنانچہ وہ دونوں ہی میدانوں میں زبردست کام کر گئے، جس سے دُنیا بھر کے مسلمانوں نے فائدہ اُٹھایا۔

علامہ مودودی کی کتابوں اور ان کے کتابچوں کا مختلف عالمی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا، اور مختلف علاقائی زبانوں میں بھی، اس طرح ان کی افادیت دوبالا ہوگئی، والحمدللہ:

- ان کتابوں میں اہم ترین کتاب ان کی شان دار تفسیر قرآن ہے، جس پر اُنھوں نے سالہا سال لگائے، بالآخر توفیق خداوندی سے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، اور اس کا نام تفہیم القرآن رکھا۔
- ان میں وہ کتابیں بھی ہیں جو اسلام اور اسلامی بنیادوں کی وضاحت کرتی ہیں، مثال کے طور پر دینیات اور خطبات وغیرہ۔
- ان میں وہ کتابیں بھی ہیں، جن میں ان بڑے بڑے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جو

مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلام کی فوقیت ثابت کرتی ہیں، اور جن میں اہل مغرب اور ان کے الزامات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، مثال کے طور پر پردہ، سود، الجہاد فی الاسلام وغیرہ۔

❖ ان میں وہ کتابیں بھی ہیں، جو جماعت اسلامی کی دعوت اور تحریک کی بنیادوں کی وضاحت کرتی ہیں، مثال کے طور پر اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟، اسلام کا نظریۂ سیاسی، دین حق، شہادت حق، اسلام کا نظام حیات، اور تجدید و احیائے دین۔

❖ ان میں وہ کتابیں بھی ہیں جو زندگی کے مختلف مسائل پر اسلامی نقطہ نظر سے گفتگو کرتی ہیں، مثال کے طور پر انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل، ملکیت زمین کا مسئلہ، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی قانون کی تدوین اور اسلامی ریاست وغیرہ۔

امام مودودی کی تحریک کا روحانی پہلو

مولانا مودودی کے ہاں دعوت و تحریک اور افراد کی تربیت کے سلسلے میں ربّانی یا روحانی پہلو سے غفلت یا کمزوری نہیں پائی جاتی، جیسا کہ دور سے دیکھنے والے کچھ دوستوں کا تاثر سننے میں آتا ہے۔ اور ایسا اس لیے ہے کہ مولانا مودودی کے رفقا پر عقلی رنگ غالب ہے، اور یہ رنگ ان کی کتابوں، کتابچوں، خطبات اور نصائح میں بھی نمایاں ہے۔ پھر اس لیے بھی کہ ان کی جماعت پر سیاسی سوچ غالب ہے، اور وہ سیاسی جماعت کے طور پر متعارف ہوئی ہے۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت نہ تو اس پہلو سے غفلت کا شکار تھی، نہ یہ پہلو ان کے یہاں طاق نسیاں کی زینت تھا، اور نہ ان کے فکر میں یا جماعت کی تاسیس کے وقت یہ پہلو احساس و شعور کے کسی ثانوی حاشیہ پر پڑا ہوا تھا۔ بلکہ عوامی رہنمائی اور خواص کی تربیت میں اس کا نمایاں کردار تھا۔ یہی وجہ ہے مفکر (مودودی) کبھی داعی اور مربی (مودودی)

پر غالب نہ آسکا۔

امام ابوالاعلیٰ مودودی سے ایک صحافی نے سوال کیا تھا: ''آپ کا راستہ بہت دشوار گزار ہے، اور آپ کو اصلاحات، یا اصلاح حال کی بہت زیادہ اُمید نہیں، پھر اس راستے میں آئندہ پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کے لیے آپ نے کیا تیاری کی ہے؟''

اس پر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا: ''رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ہمارا ہتھیار دین ہے، مصیبتوں سے نمٹنے کے لیے ہمارا ہتھیار ایمان ہے، مظالم کا سامنا کرنے کے لیے ہمارا ہتھیار صبر ہے، جیلوں اور قید خانوں کی زندگی گزارنے کے لیے ہمارا ہتھیار قرآن مجید اور ذکر الٰہی ہے اور تختۂ دار پر ہمارے لیے وجہ تسکین یہ آیت ہے:

وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی (طٰہٰ ۲۰: ۸۴) میں جلدی کر کے تیرے حضور آ گیا ہوں، اور میرے ربّ تاکہ تو مجھ سے خوش ہو جائے۔

مولانا مودودی، تحریک اسلامی میں روحانیت کو ترقی دینے کے سلسلے میں کتنے فکرمند رہتے تھے۔ اپنے ارکان و متفقین کے اندر کس طرح روحانیت کی کرنیں چمکاتے تھے، کس طرح ان کے دلوں میں محبت الٰہی کے چراغ روشن کرتے تھے، ان کے اندر اس راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کا جذبہ کس طرح ابھارتے تھے؟ ان ساری باتوں کو سمجھنے کے لیے ان کا وہ خطبہ کافی ہے، جو اُنھوں نے ۲۶ رمارچ ۱۹۴۴ء میں دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں منعقد جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع میں 'تحریک اسلامی کے علم برداروں کے لازمی اوصاف' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔

یہاں ان کے اس خطاب کے کچھ اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں جو کتاب 'روداد جماعت اسلامی' حصّہ دوم میں شامل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں، جو اس دعوت کے لیے کام کرنے والوں میں ہونی چاہییں۔ دوسری وہ جو ایک صالح جماعت بنانے

کے لیے ضروری ہیں۔ اور تیسری وہ جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے ناگزیر ہیں۔

شخصی اوصاف

شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنائے۔ یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ [13]

حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے۔

یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دُنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلے کے لیے نکلیں، اس باغی کو مطیع بنائیے، جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔

اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے، اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے، تو یہ ایک بالکل بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلان جنگ کریں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لیے تباہ کن ہے۔ پہلے خود خدا کے آگے سر جھکایے، پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجیے۔

اللہ کی طرف ہجرت

جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑ نا نہیں ہے بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے۔ [14]

۱۳۔ اس حدیث کی روایت امام احمد بن حنبل نے کی ہے (۲۳۹۶۵)۔ اس کی تخریج کرنے والوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ترمذی [م: ۹/اکتوبر ۸۹۲ء] نے کتاب الجہاد (۱۶۲۱) میں اس کو درج کرتے

ہوئے حسن صحیح قرار دیا ہے، شیخ ناصر الدین البانی[م: ۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء] نے بھی اپنے سلسلہ احادیث صحیحہ (۵۴۹) میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی روایت فضالۃ بن عبد نے کی ہے۔

۱۴۔ اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ ہجرت، جہاد سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ مومن پہلے ہجرت کرتا ہے۔ پھر جہاد کے لیے نکلتا ہے، جیسا کہ قرآن وسنت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لا اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (البقرۃ ۲:۲۱۸)، اسی طرح دوسری آیات اور احادیث بھی ہیں، مثال کے طور پر امام احمد بن حنبلؒ نے عمرو بن عبسۃ سے روایت (۱۷۰۲۷) کی ہے: ''ایک شخص نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ، اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تمہارا دل اللہ کے سامنے جھک جائے، اور مسلمان تمہاری زبان اور ہاتھ سے محفوظ ہو جائیں۔ پھر اس

اصلی مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کے وطن میں قانون الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرماں برداری اختیار نہ کی تو اس نے حماقت کی۔ یہ حقیقت بھی احادیث میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے۔ بطور مثال ایک حدیث کو لیجیے۔ آں حضور ﷺ سے پوچھا:

مَا الْهِجْرَةُ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

یا رسول اللہ کون سی ہجرت بہتر ہے۔

جواب ملا:

اَنْ تَهْجُرَ مَا کَرِهَ رَبُّکَ۔

یہ کہ تو ان چیزوں کو چھوڑ دے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔[۱۵]

اندر کا باغی اگر مطیع نہ ہو تو آدمی کا ترک وطن کر دینا خدا کی بارگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات باہر کی قوتوں سے پہلے اپنے اندر کی سرکش قوتوں سے لڑیئے اور اصطلاحی کفار کو مسلمان بنانے سے پہلے اپنے نفس کو مسلمان بنایئے۔

شخص نے سوال کیا، کون سا اسلام افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایمان، اس نے پھر سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور موت کے بعد

اُٹھائے جانے پر ایمان رکھنا۔ اس نے سوال کیا: کون سا ایمان افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہجرت۔ اس نے سوال کیا: ہجرت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: برائی سے دوری اختیار کرنا۔ اس نے کہا: کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جہاد، اس نے کہا: جہاد کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کفار سے مقابلہ ہو تو ان سے جنگ کرنا''۔ اس کی تخریج کرنے والوں نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، منذری نے الترغیب والترہیب (۱۶۸۷) میں لکھا ہے: اس کی سند صحیح ہے اور اس کے راوی وہ ہیں، جن سے صحیح میں استشہاد کیا جاتا ہے۔

۱۵۔ اس کی روایت امام احمد (۶۴۸۷) نے کی ہے، اس کی تخریج کرنے والوں نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام نسائی نے اس کو کتاب البیعۃ (۴۱۶۵) میں درج کیا ہے اور حاکم نے کتاب الایمان (۱/۱۱) میں درج کرتے ہوئے امام مسلم کے شرائط پر اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ذہبی اور امام طیالسی (۲۳۸۶) نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ البانی نے اس روایت کو سلسلہ صحیحہ (۱۲۶۲) میں شمار کیا ہے۔ اس کی روایت عبداللہ بن عمرو نے کی ہے۔

اس معنی کو جامع تر الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ حدیث نبویؐ کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنایئے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ کتنا ہی گھومے پھرے بہر حال اس حد سے آگے نہیں جاسکتا، جہاں تک رسی اسے جانے دیتی ہے:

مَثَلُ الْإِیْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِیْ آخِیَتِهٖ یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی آخِیَتِهٖ۔[16]

ایسے گھوڑے کی حالت آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے، اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس، آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں، اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔[17]

معاشرے میں دعوت الی اللہ کا کام

اس کے بعد مولانا مودودی اپنے کارکنان کو دعوت الی اللہ کا راستہ اپنانے کی تلقین کرتے ہیں، یہ وہی راستہ ہے جسے قرآن مجید کی سورہ الفرقان میں جِھَاداً کَبِیْراً سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: فَلَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ وَ جَاھِدْھُمْ بِهٖ جِھَاداً کَبِیْرًا (الفرقان ۲۵:۵۲)

'پس اے نبیؐ، کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ

زبردست جہاد کرو۔

یہ دعوت و تبلیغ کا جہاد ہے، جس میں حکمت، عمدہ نصیحت، گفتگو کے بہترین طریقوں کا استعمال

۱۶۔ امام احمد بن حنبل (۱۱۵۲۶) نے اس کی روایت کی ہے، اور اس کی تخریج کرنے والوں نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے الرقائق (۶۱۶) میں اس کو بیان کیا ہے۔ اس کی تخریج کرنے والوں نے بھی اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، اور ابویعلی نے بھی اس کی روایت (۱۳۳۲) کی ہے۔ الہیثمی نے مجمع الزوائد میں لکھا ہے: امام احمد اور ابویعلی نے ابوسعید الخدری سے اس کی روایت کی ہے اور اس کی روایت کرنے والے صحیح بخاری کے رواۃ ہیں، سوائے ابوسلیمان اللیثی اور عبداللہ بن ولید کے اور یہ دونوں ثقہ ہیں (۱۰/ ۳۳۳)

۱۷۔ روداد جماعت اسلامی، دوم (خطبہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی) مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، ۱۹۴۶ء

اور حق بات کی گواہی شامل ہے، خواہ کتنی ہی کڑوی لگے۔

اس ضمن میں امام مودودی، تحریک اسلامی کے کارکنان کو روشن ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> مگر میں بروقت یہ واضح کردوں کہ یہ ہماری کش مکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کش مکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں لڑتا بلکہ بیماری سے لڑتا ہے۔ اور اس کی تمام تر جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔ وہ اگر بیمار کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے یا اس کے کسی عضو پر نشتر چلاتا ہے تو یہ تمام تر بربنائے اخلاص ہوتا ہے، دشمنی نہیں ہوتی۔ اس کی نفرت، اور اس کا غصہ بالکلیہ مرض کے خلاف ہوتا ہے، نہ کہ مریض کے خلاف۔ بالکل اسی طرح اپنے ایک گمراہ بھائی کو ہدایت کی طرف لایے، وہ کبھی کسی بات سے یہ محسوس نہ کرے کہ اسے تحقیر سے دیکھا جارہا ہے، یا براہ راست اس کی ذات سے دشمنی کی جارہی ہے، بلکہ وہ آپ کے اندر انسانی ہمدردی، محبت اور اُخوت کو محسوس کرے۔

میں نے [پہلے] بھی مختصراً یہ کہا تھا کہ اصلی تبلیغ تقریری اور تحریری مناظروں سے نہیں ہوا

کرتی۔ یہ کام کرنے کے بہت ہی ادنیٰ طریقے ہیں۔ اصل تبلیغ یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کا مجسم ظہور اور نمونہ ہوں۔ جہاں کہیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے یہ نمونہ گزر جائے، وہ آپ کے طرزِ عمل سے پہچان لیں کہ یہ ہیں خدا کی راہ کے راہی۔ اسی طرح آپ ایسے فنافی الاسلام بن جایئے کہ جہاں آپ سامنے آئیں اسلامی تحریک کا پورا نقشہ واضح ہو جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: فَإِذَا رُؤُوا ذُکِرَ اللّٰہ۔[18]

نصیحت اور ہدایات

۱۳ رنومبر ۱۹۵۱ء کو جماعت اسلامی کے اجتماع عام منعقدہ کراچی کے آخری اجلاس میں 'ہدایات' کے عنوان سے امام سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خطاب کرتے ہوئے بہت ہی مضبوط

۱۸۔ روداد جماعت اسلامی، دوم (خطبہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی) مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، ۱۹۴۶ء

اور مؤثر انداز میں فرمایا تھا:

> رفقائے عزیز! چار دن کے اجتماع کے بعد اب ہم لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو رہے ہیں۔ جتنا کام اس اجتماع میں کرنا تھا ہم کر چکے ہیں اور ایک حد تک ہم اس کا جائزہ بھی اپنے اجتماع خاص میں لے چکے ہیں۔ اب رخصت ہونے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنے رفقاء سے خطاب کر کے انھیں وہ ضروری ہدایات دے دوں جو آئندہ اس کام کو صحیح طریقے پر چلانے کے لیے مطلوب ہیں۔

مولانا مودودی نے ''تعلق باللہ'' کی ضرورت کے عنوان سے جو کچھ فرمایا ہے، ضروری ہے کہ اس کو یہاں نقل کر دیا جائے، تاکہ یہ نہ گمان کیا جائے کہ مولانا مودودی محض ایک عقلیت پسند انسان تھے اور روحانیت کے پہلو سے ان کے یہاں کمزوری پائی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس گمان کا اصل سبب مولانا مودودیؒ کی تحریروں کا ناقص مطالعہ ہے۔

تعلق باللہ

[۱۳رنومبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے] مولانا مودودی فرماتے ہیں:

اوّلین چیز جس کی ہدایت ہمیشہ سے انبیاء اور خلفائے راشدین اور صلحائے اُمت ہر موقعے پر اپنے ساتھیوں کو دیتے رہے ہیں، وہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی محبت دل میں بٹھانے اور اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی ہدایت ہے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کو ہر دوسری چیز پر مقدم ہی ہونا چاہیے۔

عقیدے میں اللہ پر ایمان مقدم ہے۔ عبادت میں اللہ سے دل کا لگاؤ مقدم ہے۔ اخلاق میں اللہ کی خشیت مقدم ہے۔ معاملات میں اللہ کی رضا کی طلب مقدم ہے اور فی الجملہ ہماری ساری زندگی ہی کی درستی کا انحصار اس پر ہے کہ ہماری دوڑ دھوپ اور سعی وجہد میں رضائے الٰہی کی مقصودیت ہر دوسری غرض پر مقدم ہو۔

پھر خصوصیت کے ساتھ یہ کام جس کے لیے ہم ایک جماعت کی صورت میں اٹھے ہیں، یہ تو سراسر تعلق باللہ ہی کے بل پر چل سکتا ہے۔ یہ اتنا ہی مضبوط ہوگا، جتنا اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوگا، اور یہ اتنا ہی کمزور ہوگا جتنا خدانخواستہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کمزور ہوگا۔

ظاہر بات ہے کہ آدمی جو کام بھی کرنے اٹھتا ہے، خواہ وہ دُنیا کا کام ہو یا دین کا، اس کی اصل محرک وہ غرض ہوتی ہے جس کی خاطر وہ کام کرنے اٹھا ہے اور اس میں سرگرمی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اس غرض کے ساتھ آدمی کی دلچسپی میں گہرائی اور گرم جوشی ہو۔

نفس کے لیے کام کرنے والا خودغرضی کے بغیر نفس پرستی نہیں کرسکتا اور نفس کی محبت میں جتنی شدت ہوتی ہے، اتنی ہی سرگرمی کے ساتھ وہ اس کی خدمت بجالاتا ہے۔ اولاد کے لیے کام کرنے والا اولاد کی محبت میں دیوانہ ہوتا ہے۔ تب ہی وہ اپنے عیش وآرام کو اولاد کی بھلائی پر قربان کرتا ہے، اور اپنی دُنیا ہی نہیں، اپنی عاقبت تک اس غرض کے لیے

خطرے میں ڈال دیتا ہے کہ اس کے بچے زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔

قوم یا وطن کے لیے کام کرنے والا قوم وملک کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے۔ تب ہی وہ قوم وملک کی آزادی، حفاظت اور برتری کی فکر میں مالی نقصانات اٹھاتا ہے، قید وبند کی سختیاں جھیلتا ہے، شب وروز کی محنتیں صرف کرتا ہے، اور جان تک قربان کر دیتا ہے۔

اب اگر ہم یہ کام نہ اپنے نفس کے لیے کر رہے ہیں، نہ کوئی خاندانی غرض اس کی محرک ہے، نہ کوئی ملکی وقومی مفاد اس میں ہمارے پیش نظر ہے، بلکہ صرف ایک اللہ کو راضی کرنا ہمیں مطلوب ہے، اور اسی کا کام سمجھ کر ہم نے اسے اختیار کیا ہے، تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک اللہ ہی سے ہمارا تعلق گہرا اور مضبوط نہ ہو، یہ کام کبھی نہیں چل سکتا، اور اس میں سرگرمی آسکتی ہے تو اسی وقت، جبکہ ہماری ساری رغبتیں اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں مرکوز ہو جائیں۔

اس کام میں جو لوگ شریک ہوں، ان کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ان کا تعلق اللہ سے بھی ہو، بلکہ ان کا تعلق اللہ سے ہی ہونا چاہیے۔ اسے تعلقات میں سے ایک تعلق نہیں بلکہ ایک ہی اصلی اور حقیقی تعلق ہونا چاہیے۔ اور انھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہنی چاہیے کہ اللہ سے ان کا تعلق گھٹے نہیں بلکہ روز بروز بڑھتا اور گہرا ہوتا چلا جائے۔

اس معاملے میں ہمارے درمیان دو رائیں نہیں ہیں کہ تعلق باللہ ہی ہمارے اس کام کی جان ہے۔ جماعت کا کوئی رفیق الحمدللہ اس کی اہمیت کے احساس سے غافل نہیں ہے۔ البتہ جو سوالات اکثر لوگوں کو پریشان رکھتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ تعلق باللہ سے ٹھیک مراد کیا ہے؟ اس کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا طریقہ کیا ہے؟ اور آخر ہم کس طرح یہ معلوم کریں کہ ہمارا تعلق واقعی اللہ سے ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے؟

ان سوالات کا کوئی واضح جواب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ گویا اپنے آپ کو ایک بے نشان صحرا میں پا رہے ہیں، جہاں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان

کی منزل مقصود ٹھیک کس سمت میں ہے، اور کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ انھوں نے کتنا راستہ طے کیا، اور اب کس مرحلے میں ہیں اور آگے کتنے مراحل باقی ہیں۔

اسی وجہ سے بسا اوقات ہمارا کوئی رفیق مبہم تصورات میں گم ہونے لگتا ہے، کوئی ایسے طریقوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو موصل الی المقصود نہیں ہیں۔ کسی کے لیے مقصود سے قریب کا تعلق اور دور کا تعلق رکھنے والی چیزوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور کسی پر حیرت کا عالم طاری ہے۔ اس لیے آج میں صرف تعلق باللہ کی نصیحت ہی پر اکتفا نہ کروں گا بلکہ اپنے علم کی حد تک ان سوالات کا بھی واضح جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

تعلق باللہ کے معنی

اپنے اسی سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے ، امام مودودی ایک صاحب بصیرت ، ایک نکتہ رس اور ایک بہترین مربی کی زبان میں تعلق باللہ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

تعلق باللہ سے مراد، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے، یہ ہے کہ آدمی کا جینا اور مرنا اور اس کی عبادتیں اور قربانیاں سب کی سب اللہ کے لیے ہوں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶:۱۲۶)

کہو، میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے۔

اور وہ پوری طرح یکسو ہو کر، اپنے دل کو بالکل اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرے:

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ (البینہ ۹۸:۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر۔

نبی ﷺ نے مختلف مواقع پر اپنے ارشادات میں اس تعلق کی ایسی تشریح فرمادی ہے کہ اس کے مفہوم و مدعا میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا ہے۔ حضور ﷺ کے بیانات کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلق باللہ کے معنی ہیں: **خَشْيَةِ اللهِ فِي السِّرِ وَ الْعَلَانِيَةِ** کھلے اور چھپے ہر کام میں اللہ کا خوف محسوس کرنا۔ [19]

اور یہ کہ: **اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِي يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِنْ مَا فِي يَدِ اللهِ**، اپنے ذرائع و وسائل

۱۹۔ اس کی روایت ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء (۲/ ۳۴۳) میں، طبرانی نے اوسط (۵۴۵۲) میں، بیہقی نے شعب الایمان کے باب الخوف من اللہ (۷۳۱) میں کی ہے۔ احیاء العلوم (ص: ۱۱۴۵) کی تخریج میں عراقی نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، البانی نے صحیح الجامع (۳۰۳۹) میں اس کو حسن قرار دیا ہے، منذری نے الترغیب والترہیب (۲۵۴) میں لکھا ہے: یہ صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے، اور اس کی اسناد میں گرچہ کلام کیا جاسکتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی وہ حسن ہے، اور انس بن مالک نے اس کی روایت کی ہے۔

کی بہ نسبت تیرا بھروسا اللہ کی قدرت پر زیادہ ہو۔ [20]

اور یہ کہ: **مَنِ الْتَمَسَ رِضَى اللهِ بِسَخَطِ النَّاسِ**، آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لیے لوگوں کو ناراض کرلے۔ اور اس کے بالکل برعکس حالت یہ ہے کہ آدمی لوگوں کو راضی کرنے کے لیے اللہ کی ناراضی مول لے، **مَنِ الْتَمَسَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللهِ**۔ [21]

پھر جب یہ تعلق بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جائے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اس کا دینا اور روکنا جو کچھ بھی ہو، اللہ کے لیے اور اللہ ہی کی خاطر ہو، اور نفسانی رغبت و نفرت کی لاگ اس کے ساتھ نہ لگی رہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے تعلق باللہ کی تکمیل کرلی ہے:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَ اَبْغَضَ لِلّٰهِ وَ اَعْطٰى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ [22]

جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کی خاطر دشمنی کی، اور اللہ ہی کے لیے دیا اور اللہ ہی کے لیے روک لیا، تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

پھر یہ جو آپ رات کو اپنی دُعائے قنوت میں پڑھتے ہیں۔ اس کا لفظ لفظ اس تعلق کی

نشان دہی کرتا ہے، جو آپ کا اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کے الفاظ پر غور کیجیے اور دیکھتے جایئے کہ آپ ہر رات اپنے اللہ کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھنے کا اقرار کیا کرتے ہیں:

۲۰۔ ابن ابی الدنیا نے اس کو الزھد (۱۰۷) میں درج کیا ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان کے باب الصبر علی المصائب (۹۵۹۷) میں یونس بن میسرۃ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

۲۱۔ اس میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے ''من التمس رضاء اللہ بسخط الناس کفاہ اللہ مؤنۃ الناس، ومن التمس رضاء الناس بسخط اللہ وکلہ اللہ الی الناس''، اس کی روایت ترمذی نے کتاب الزھد (۲۴۱۴) میں اور ابن حبان نے کتاب البر والاحسان (۲۷۶) میں کی ہے، اور اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی سند حسن ہے، اور البانی نے صحیح الجامع (۶۰۱۰) میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی روایت اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے کی ہے۔

۲۲۔ اس کی روایت ابوداؤد نے کتاب السنۃ (۴۶۸۱) میں، طبرانی نے مجم (۸/ ۱۳۴) میں کی ہے، اور البانی نے سلسلہ صحیحہ (۳۸۰) میں، اور ذہبی نے اپنے شیوخ کی مجم میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی روایت ابوامامۃ نے کی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَيْکَ وَنُثْنِیْ عَلَيْکَ

الْخَيْرَ ط وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ يَّفْجُرُکَ ط اَللّٰهُمَّ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ ط

خدایا، ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے معافی چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسا رکھتے ہیں، اور سب اچھی تعریفیں تیرے ہی لیے مخصوص کرتے ہیں، ہم تیرے شکر گزار ہیں، کفرانِ نعمت کرنے والے نہیں ہیں، ہم ہر اس شخص کو چھوڑ دیں گے جو تیری نافرمانی کرے۔ خدایا، ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیرے ہی لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں، اور ہماری ساری دوڑ دھوپ تیری طرف ہی ہے۔ ہم تیری رحمت کے اُمیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ یقیناً تیرا

سخت عذاب ان لوگوں کو پہنچنے والا ہے، جو کافر ہیں۔ [۲۳]

پھر اسی تعلق باللہ کی تصویر اس دعا میں پائی جاتی ہے، جو نبی ﷺ رات کو تہجد کے لیے اُٹھتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ اس میں آپ، اللہ کو خطاب کر کے عرض کرتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ لَکَ اَسۡلَمۡتُ وَبِکَ اٰمَنۡتُ وَعَلَیۡکَ تَوَکَّلۡتُ وَاِلَیۡکَ اَنَبۡتُ وَبِکَ خَاصَمۡتُ وَاِلَیۡکَ حَاکَمۡتُ

خدایا، میں تیرا ہی مطیع فرمان ہوا اور تجھی پر ایمان لایا، اور تیرے ہی اوپر میں نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا۔ اور تیری خاطر میں لڑا، اور تیرے ہی حضور اپنا مقدمہ لایا۔ [۲۴]

۲۳۔ یہ نبی کریم ﷺ سے منقول وہ دُعائے قنوت ہے، جس کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کی ہے اور احناف وتر کی تیسری رکعت میں رکوع سے اٹھنے کے بعد اس کو پڑھنے کے قائل ہیں، ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان اسی پر عمل کرتے ہیں، اس کو ابن ابی شیبہ نے باب فی صلوۃ التطوع (۳۰۴۲۶) میں درج کیا ہے۔

تعلق باللہ بڑھانے کا طریقہ

آگے علامہ مودودی نے تعلق باللہ کو مضبوط بنانے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اب دیکھنا چاہیے کہ اس تعلق کو پیدا کرنے اور بڑھانے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کو پیدا کرنے کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آدمی سچے دل سے اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک، معبود، اور حاکم تسلیم کرے۔ الوہیت کی تمام صفات اور حقوق اور اختیارات کو اللہ کے لیے مخصوص مان لے، اور اپنے قلب کو شرک کے ہر شائبے سے پاک کردے۔

یہ کام جب آدمی کر لیتا ہے تو اللہ سے اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

رہا اس تعلق کا نشوونما، تو وہ دو طریقوں پر منحصر ہے: ایک فکر وفہم اور دوسرا عمل کا طریقہ۔

فکر و فہم کے طریقے سے اللہ کے ساتھ تعلق بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ آپ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی مدد سے ان نسبتوں کو تفصیل کے ساتھ اور زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھیں جو آپ کے اور خدا کے درمیان فطرتاً ہیں اور بالفعل ہونی چاہییں۔ ان نسبتوں کا ٹھیک ٹھیک احساس وادراک اور ذہن میں ان کا استحضار صرف اسی طریقے سے ممکن ہے کہ آپ قرآن وحدیث کو سمجھ کر پڑھیں۔ بار بار اس کے مطالعے کی تکرار کرتے رہیں اور ان کی روشنی میں جو جو نسبتیں آپ کے اور خدا کے درمیان معلوم ہوں، ان پر غور وفکر کر کے اور اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھتے رہیں کہ ان میں سے کس کس نسبت کو آپ نے بالفعل قائم کر رکھا ہے؟ کہاں تک اس کے تقاضے آپ پورے کر رہے ہیں؟ اور کس کس پہلو میں آپ کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟ یہ احساس اور یہ استحضار جتنا جتنا

۲۴۔متفق علیہ، بخاری نے باب الجمعۃ (۱۱۲۰) میں اور مسلم نے باب فی صلٰوۃ المسافرین (۷۶۹) میں ابن عباس کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے۔

بڑھے گا، ان شاء اللہ اسی تناسب کے ساتھ اللہ سے آپ کا تعلق بھی بڑھے گا۔

مثال کے طور پر ایک نسبت آپ کے اور اللہ کے درمیان یہ ہے کہ آپ عبد ہیں اور وہ معبود ہے۔ دوسری نسبت یہ ہے کہ آپ زمین پر اس کے خلیفہ ہیں اور اس نے اپنی بے شمار امانتیں آپ کے سپرد کر رکھی ہیں۔ تیسری نسبت یہ ہے کہ آپ ایمان لا کر اس کے ساتھ ایک بیع کا معاہدہ کر چکے ہیں، جس کے مطابق آپ نے اپنی جان ومال اس کے ہاتھ بیچی ہے اور اس نے جنت کے وعدے پر خریدی ہے۔ چوتھی نسبت آپ کے اور اس کے درمیان یہ ہے کہ آپ اس کے سامنے جواب دہ ہیں اور وہ آپ کا حساب صرف آپ کے ظاہری لحاظ سے لینے والا نہیں ہے بلکہ آپ کی جملہ حرکات وسکنات، بلکہ آپ کی نیتوں اور ارادوں تک کا ریکارڈ اس کے پاس محفوظ ہو رہا ہے۔

غرض یہ اور دوسری بہت سی نسبتیں ایسی ہیں، جو آپ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان موجود ہیں، بس انھی نسبتوں کو سمجھنے، محسوس کرنے، یاد رکھنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے پر

اللہ کے ساتھ آپ کے تعلق کا بڑھنا اور قریب تر ہونا موقوف ہے۔ آپ جس قدر ان سے غافل ہوں گے، اللہ سے آپ کا تعلق اتنا ہی کمزور ہوگا۔ اور جس قدر زیادہ ان سے خبر دار اور ان کی طرف متوجہ رہیں گے، اسی قدر آپ کا تعلق گہرا اور مضبوط ہوگا۔

لیکن یہ فکری طریقہ اس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ دیر تک نباہا بھی نہیں جاسکتا، جب تک کہ عملی طریقے سے اس کو مدد اور قوت نہ پہنچائی جائے اور وہ عملی طریقہ ہے، احکام الٰہی کی مخلصانہ اطاعت اور ہر اس کام میں جان لڑا کر دوڑ دھوپ کرنا، جس کے متعلق آدمی کو معلوم ہو جائے کہ اس میں اللہ کی رضا ہے۔

احکام الٰہی کی مخلصانہ اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ جن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ہے، ان کو آپ بادل نخواستہ نہیں بلکہ اپنے دل کی رغبت اور شوق کے ساتھ خفیہ اور علانیہ انجام دیں، اور اس میں کسی دنیوی غرض کو نہیں بلکہ صرف اللہ کی خوش نودی کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور جن کاموں سے اللہ نے روکا ہے، ان سے قلبی نفرت وکراہت کے ساتھ خفیہ اور علانیہ پرہیز کریں۔ اور اس پرہیز کا محرک کسی دنیوی نقصان کا خوف نہیں، بلکہ اللہ کے غضب کا خوف ہو۔ یہ طرزِ عمل آپ کو تقویٰ کے مقام پر پہنچا دے گا۔

اس کے بعد دوسرا طرزِ عمل آپ کو احسان کی منزل پر پہنچائے گا۔ یعنی یہ کہ آپ دُنیا میں ہر اس بھلائی کو فروغ دینے کی کوشش کریں، جسے اللہ پسند فرماتا ہے اور ہر اس برائی کو دبانے کی کوشش کریں، جسے اللہ ناپسند فرماتا ہے۔ اس کی کوشش میں جان، مال، وقت، محنت، اور دل ودماغ کی قابلیت غرض کسی چیز کے قربان کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیں۔

پھر اس راہ میں جو قربانی بھی آپ کریں، اس پر کوئی فخر آپ کے دل میں پیدا نہ ہو۔ نہ یہ خیال کبھی آپ کے دل میں آئے کہ آپ نے کسی پر احسان کیا ہے، بلکہ بڑی سے بڑی قربانی کر کے بھی آپ یہی سمجھتے رہیں کہ آپ کے خالق کا جو حق آپ پر تھا وہ پھر بھی ادا نہیں ہوسکا ہے۔

تعلق باللہ میں ترقی کے وسائل

اس طرزِ عمل کو اختیار کرنا درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت دشوار گزار گھاٹی ہے جس پر چڑھنے کے لیے بڑی طاقت درکار ہے۔

علامہ مودودی نے ان تدبیروں پر بھی غور وفکر کیا ہے جن کے ذریعے آدمی کے اندر یہ قوت پیدا ہوسکتی ہے، وہ یہ ہیں:

نماز، نہ صرف فرض اور سنت، بلکہ حسبِ استطاعت نوافل بھی۔ مگر یاد رکھیے، کہ نوافل زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ پڑھنے چاہییں۔

ذکرِ الٰہی، جو زندگی کے تمام احوال میں جاری رہنا چاہیے۔ اس کے وہ طریقے صحیح نہیں ہیں، جو بعد کے ادوار میں صوفیا کے مختلف گروہوں نے خود ایجاد کیے یا دوسروں سے لیے۔ بلکہ بہترین طریقہ وہ ہے، جو نبی ﷺ نے اختیار فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو سکھایا۔ آپ نے آنحضور ﷺ کے تعلیم کردہ اذکار اور دُعاؤں میں سے جس قدر بھی یاد کرسکیں یاد کرلیں، مگر الفاظ کے ساتھ ان کے معانی بھی ذہن نشین کیجیے، اور معانی کے استحضار کے ساتھ ان کو وقتاً فوقتاً پڑھتے رہا کیجیے۔ یہ اللہ کی یاد کو تازہ رکھنے کا ایک نہایت موثر ذریعہ ہے۔

روزہ نہ صرف فرض بلکہ نفل بھی۔ ان میں خاص طور پر تقویٰ کی کیفیت کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، جسے قرآن مجید روزے کی اصل غایت بتاتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ، نہ صرف فرض، بلکہ نفل بھی۔

تعلق باللہ کو ناپنے کا پیمانہ

علامہ مودودی اپنے رفقا کے سامنے اس پیمانے کی وضاحت کرتے ہیں، جس سے ان کو اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ اللہ رب العزت کے ساتھ ان کے تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی؟

وہ آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے ہٹ رہے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں:

اس کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ہم کیونکر یہ معلوم کریں کہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کتنا ہے؟ اور ہمیں کیسے پتہ چلے کہ وہ بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسے معلوم کرنے کے لیے آپ کو خواب کی بشارتوں اور کشف و کرامات کے ظہور، اور اندھیری کوٹھری میں انوار کے مشاہدے کا انتظار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس تعلق کو ناپنے کا پیمانہ تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے قلب میں رکھ دیا ہے۔ آپ بیداری کی حالت میں اور دن کی روشنی میں، ہر وقت اس کو ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔

اپنی زندگی کا، اپنی مساعی کا، اور اپنے جذبات کا جائزہ لیجیے۔ اپنا حساب آپ خود لے کر دیکھئے کہ: ایمان لا کر اللہ سے بیع کا جو معاہدہ آپ کر چکے ہیں، اسے آپ کہاں تک نباہ رہے ہیں؟ اللہ کی امانتوں میں آپ کا تصرف ایک امین ہی کا سا تصرف ہے یا کچھ خیانت بھی پائی جاتی ہے؟ آپ کے اوقات اور محنتوں، قابلیتوں اور اموال کا کتنا حصّہ خدا کے کام میں جا رہا ہے اور کتنا دوسرے کاموں میں؟ آپ کے اپنے مفاد اور جذبات پر چوٹ پڑے تو آپ کے غصّے اور بے کلی کا کیا حال ہوتا ہے؟ اور جب خدا کے معاملے میں بغاوت ہو رہی ہو تو اسے دیکھ کر آپ کے دل کی کڑھن اور آپ کے غضب اور بے چینی کی کیا کیفیت رہتی ہے؟

یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ہیں، جو آپ خود اپنے نفس سے کر سکتے ہیں، اور اس کا جواب لے کر ہر روز معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں، اور ہے تو کتنا ہے، اور اس میں کمی ہو رہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے۔

رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلیات، تو آپ ان کے اکتساب کی فکر میں نہ پڑیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادی دُنیا کے دھوکا دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت کو پا لینے سے بڑا کوئی کشف نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذرّیت کے دلاے

ہوئے ڈراؤوں اور لالچوں کے مقابلے میں راہ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔

کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے، اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو ربّ مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کی راہ پر چلنے سے ملتی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ''نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

دُنیا پر آخرت کو ترجیح

امام مودودیؒ اپنی ان ہدایات کو ایک ضروری اور آخری ہدایت پر ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تعلق باللہ کے بعد دوسری چیز جس کی میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہر حال میں دُنیا پر آخرت کو ترجیح دیجیے اور اپنے ہر کام میں آخرت ہی کی فوز و فلاح کو مقصود بنائیے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ دائمی اور ابدی زندگی کا مقام آخرت ہے اور دُنیا کے اس عارضی قیام گاہ میں ہم صرف اس امتحان کے لیے بھیجے گئے ہیں کہ خدا کے دیے ہوئے تھوڑے سے سروسامان، تھوڑے سے اختیارات اور گنے چنے اوقات و مواقع میں کام کر کے، ہم میں سے کون اپنے آپ کو خدا کی جنت کا مستقل آبادکار بننے کے لیے

موزوں ثابت کرتا ہے۔

یہاں [اس دُنیا میں] جس چیز کا امتحان ہم سے لیا جارہا ہے، وہ یہ نہیں کہ ہم صنعتیں اور تجارتیں اور کھیتیاں اور سلطنتیں چلانے میں کیا کمالات دکھاتے ہیں، اور عمارتیں اور سڑکیں کیسی اچھی بناتے ہیں؟ اور ایک شان دار تمدّن پیدا کرنے میں کتنی کامیابی حاصل کرتے ہیں؟ بلکہ سارا امتحان صرف اس امر کا ہے کہ ہم خدا کی دی ہوئی امانتوں میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرنے کی کتنی قابلیت رکھتے ہیں؟ باغی اور خودمختار بن کر رہتے ہیں یا مطیع وفرماں بردار بن کر؟ خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرتے ہیں یا اپنے نفس اور اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ [آل عمران ۳: ۶۴] کی؟

خدا کی دُنیا کو خدائی معیار کے مطابق سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں یا بگاڑنے کی؟ اور خدا کی خاطر شیطانی قوتوں سے کشمکش اور مقابلہ کرتے ہیں یا ان کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں؟

جنت میں آدم وحوا علیہما السلام کا جو پہلا امتحان ہوا تھا، وہ دراصل اسی امر میں تھا۔ اور آخرت میں جنت کی مستقل آبادی کے لیے نوع انسان کے افراد کا جو انتخاب ہوگا وہ بھی اسی فیصلہ کن سوال پر ہوگا۔

پس، کامیابی وناکامی کا اصل معیار یہ نہیں ہے کہ امتحان دینے کے دوران میں کس نے تختِ شاہی پر بیٹھ کر امتحان دیا اور کس نے تختۂ دار پر؟ اور کس کی آزمائش ایک سلطنت عظیم دے کر کی گئی اور کسے ایک جھونپڑی میں آزمایا گیا؟ امتحان گاہ کے یہ وقتی اور عارضی حالات اگر اچھے ہوں تو یہ فوز وفلاح کی دلیل نہیں اور برے ہوں تو یہ خائب وخاسر رہ جانے کے ہم معنی نہیں۔ اصل کامیابی جس پر ہمیں اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ دُنیا کی اس امتحان گاہ میں جس جگہ بھی ہم بٹھائے گئے ہوں اور جو کچھ بھی دے کر ہمیں آزمایا گیا ہو، اس میں ہم اپنے آپ کو خدا کا وفادار بندہ اور اس کی مرضیات کا

متبع ثابت کریں، تاکہ آخرت میں ہم کو وہ پوزیشن ملے جو خدا نے اپنے وفاداروں کے لیے رکھی ہے۔

حضرات! یہ ہے اصل حقیقت، مگر یہ ایسی حقیقت ہے کہ جسے محض ایک دفعہ سمجھ لینا اور مان جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اسے ہر وقت ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے سخت کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ ہم آخرت کے منکر نہ ہونے کے باوجود دُنیا میں اس طریقے پر کام کرنے لگیں جو آخرت کو بھول کر اور دُنیا کو مقصود بنا کر کام کرنے والوں کا طریقہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت ایک غیر محسوس چیز ہے، جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ اس دُنیا میں ہم اس کا اور اس کے اچھے برے نتائج کا ادراک صرف ذہنی توجہ ہی سے کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس دُنیا ایک محسوس چیز ہے، جو اپنی تلخیاں اور شیرینیاں ہر وقت ہمیں چکھاتی رہتی ہے۔ اور جس کے اچھے اور برے نتائج ہر آن ہمارے سامنے آ کر ہمیں یہ دھوکا دیتے رہتے ہیں کہ اصل نتائج بس یہی ہیں۔

آخرت بگڑے تو اس کی تھوڑی بہت تلخی ہمیں صرف ایک دل کے چھپے ہوئے ضمیر میں محسوس ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ زندہ ہو۔ مگر دُنیا بگڑے تو اس کی چبھن ہمارا رونگٹا رونگٹا محسوس کرتا ہے اور ہمارے بال بچے، عزیز و اقارب، دوست، آشنا اور سوسائٹی کے لوگ، سب مل جل کر اسے محسوس کرتے اور کراتے ہیں۔

اسی طرح آخرت سنورے تو اس کی کوئی ٹھنڈک ہمیں ایک گوشۂ دل کے سوا کہیں محسوس نہیں ہوتی، اور وہاں بھی صرف اس صورت میں محسوس ہوتی ہے جب کہ غفلت نے دل کے اس گوشے کو سُن نہ کر دیا ہو۔ مگر اپنی دُنیا کا سنوار ہمارے پورے وجود کے لیے لذت بن جاتا ہے، ہمارے تمام حواس اس کو محسوس کرتے ہیں اور ہمارا سارا ماحول اس کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آخرت کو بطور ایک عقیدے کے مان لینا چاہے بہت مشکل نہ ہو، مگر اسے اندازِ فکر اور اخلاق و اعمال کے پورے نظام کی بنیاد بنا کر زندگی بھر کام کرنا سخت مشکل ہے، اور دُنیا کو زبان سے ہیچ کہہ دینا چاہے کتنا ہی آسان ہو، مگر دل سے اس کی محبوبیت اور خیال سے اس کی مطلوبیت کو نکال پھینکنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ کیفیت بڑی کوشش سے حاصل ہوتی ہے اور پیہم کوشش کرتے رہنے سے قائم رہ سکتی ہے۔ [۲۵]

مولانا مودودی کا بے پناہ صبر و تحمل

مولانا مودودی کا اندازِ فکر یہ تھا کہ سب سے زبردست تبدیلی ذہنی اور فکری تبدیلی ہوتی ہے۔ انسان کا فکر اور ارادہ ہی اس کا قائد ہوتا ہے۔ مولانا مودودی وہی کہتے جو قرآن مجید کہتا ہے، یعنی افراد کو تبدیل کرو اور ان کے ذہن و فکر کو تبدیل کر دو، تاریخ خود بدل جائے گی:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد ۱۳:۱۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی مطلوبہ تبدیلی لانے کے لیے نہ تو ہتھیار اُٹھانے کے قائل

۲۵۔ روداد جماعت اسلامی، ششم [خطاب، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، بہ عنوان ہدایات]

تھے، نہ کسی طرح کے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے قائل تھے، اور نہ فوجی انقلابات کے راستے سے آنے والی کسی تبدیلی کے قائل تھے۔

مولانا مودودی اور ان کی تحریک نے سخت ترین حالات کا سامنا کیا، شدید چیلنج درپیش ہوئے، بدترین قسم کی زیادتیاں ہوئیں۔ مختلف مواقع پر ان کا خون بھی بہانے سے گریز نہیں کیا گیا۔ ایسی صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ دشمن پارٹیوں اور حکمرانوں، جن کو نہ اللہ کا خوف تھا اور نہ مخلوق سے ہمدردی، ان کی جانب سے ہونے والے پرتشدد حملوں کے نتیجے میں جماعت اسلامی کی پرامن جدوجہد کی سوچ شکست سے دوچار ہوجاتی اور جوابی تشدد کی طرف چل پڑتی۔

مگر مولانا مودودی کے قدموں میں ذرا لغزش نہ آئی، انھوں نے اپنے اصولوں سے ذرا بھی ہٹنا گوارا نہ کیا، اور زندگی کی آخری سانس تک فکری ہتھیاروں اور دلیل و برہان کے ذریعے باطل کا مقابلہ کرتے رہے۔

ایک ایسا وقت بھی آیا جبکہ مولانا مودودی کے مخالفین نے شرارت کی انتہا کر دی۔ ایسی ایسی حرکتیں اور بہتان تراشیاں کیں کہ بڑے سے بڑے حلیم کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے۔ ایسے میں مولانا کے بعض ساتھیوں نے اسی انداز سے جواب دینا چاہا، تو مولانا نے سختی سے روک دیا۔

ساتھیوں نے کہا کہ ''وہ آپ کے ساتھ بدتمیزی کر کے ہمیں شدید تکلیف پہنچا رہے ہیں''۔ مولانا مودودی نے جواب دیا: ''جب وہ زیادہ تکلیف پہنچائیں تو تم زیادہ صبر سے کام لو، بلکہ اتنا صبر کرو کہ صبر کا ریکارڈ ٹوٹ جائے!''

گذشتہ صدی عیسوی میں ساٹھ کے عشرے کے شروع میں، اس وقت پاکستان کے پہلے فوجی حکمراں [۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء-۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء] صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان [م: ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء] نے جماعت اسلامی پر گھیرا تنگ کرنے کی کافی کوشش کی، اور جماعت کو کچلنے کے لیے ہر حربہ اختیار کر ڈالا، لیکن اس کو کوئی بہانہ نہیں مل سکا جس کو بنیاد بنا کر جماعت کے اجتماعات اور اس کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دے۔ حتیٰ کہ جب [۲۶-۲۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں] جماعت اسلامی کا سالانہ کل پاکستان اجتماع لاہور میں ہوا تو فوجی حکومت نے امام مودودی کے خطاب کے دوران، اُن پر گولی چلوادی، لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ نشانہ خطا ہو گیا اور گولی ایک دوسرے رکن جماعت [اللہ بخش] کو لگ گئی [جو موقعے پر شہید ہو گئے]۔

اس وقت امام مودودی کے قریب کھڑے لوگوں نے اُن سے کہا:

''آپ بیٹھ جائیں، گولی چل رہی ہے''۔

اس پر امام مودودی نے برجستہ جواب دیا:

''اگر میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا؟''

امام مودودی کبھی غصّے سے بے قابو نہیں ہوئے، نہ صرف اُس موقعے پر، بلکہ اس کے بعد بھی اُس نوعیت کے کئی مواقع آئے، مگر وہ امام ابوالاعلیٰ مودودی کو ہلا نہ سکے، اور وہ اُنھیں تشدد کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کر سکے۔

مولانا مودودی کے ناقدین کی اقسام

مولانا مودودی جیسا عظیم انسان، جو مفکر بھی ہو، مجدّد بھی ہو، ایک اسلامی تحریک کا داعی بھی ہو، اور اس کا اپنا ایک اور یکجا منہجِ فکر اور اپنا ایک خاص مزاج ہو۔ جس کا فکر کسی سے مستعار نہ ہو اور جو ایک انقلابی دعوت کا علم بردار ہو، ایسے عظیم انسان کے سلسلے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ناقدین اور مخالفین نہیں ہوں گے۔

نہ تو گزرے ہوئے ماضی میں کوئی ایسا عظیم انسان ملے گا اور نہ دورِ حاضر میں، جس کے سلسلے میں لوگوں کی رائیں مختلف نہ ہوں۔ کچھ ناقدین ہوں گے اور کچھ محبین ہوں گے، کچھ محبت اور تعریف میں غلو کرنے والے ہوں گے اور کچھ نفرت اور تنقید میں حد سے گزر جانے والے ہوں گے، جیسا کہ مختلف مسائل اور اشوز میں لوگوں کا حال ہوتا ہے، سوائے ان کے جن پر ربّ کی خاص عنایت ہو، اور ایسے افراد بہت کم ملیں گے۔

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، اللہ انھیں اپنی چاہتوں کے تاج پہنائے، وہ فرمایا کرتے تھے:

> میرے سلسلے میں دونوں ہی ہلاک ہو گئے، محبت میں غلو کرنے والے بھی اور نفرت میں حد سے تجاوز کرنے والے بھی۔[۲۶]

علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

۲۶۔ اس کی روایت امام احمد بن حنبل نے باب فی فضائل الصحابہ (۱۳۷۶) میں کی ہے۔ اس کی تخریج کرنے والوں نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے، بوصیری نے اتحاف الخیرۃ (۶۶۷۶) میں لکھا ہے: احمد بن منیع نے اس کی روایت کی ہے اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں۔

''قدیم زمانے سے یہ کہا جاتا ہے کہ، پچھلے لوگوں میں سے کسی کے عز وشرف پر، اس کے سلسلے میں لوگوں کے اختلاف سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے کہا: علی بن ابی طالب کو دیکھو کہ ان کے سلسلے میں دونوں ہی طرح کے لوگ ہلاک ہوئے، محبت میں غلو کرنے والے بھی اور نفرت میں حد سے تجاوز کرنے والے بھی۔ حدیث میں آتا ہے: ان کی وجہ سے دونوں ہی آدمی ہلاک ہوں گے، محبت میں حد سے تجاوز کرنے والا بھی اور نفرت میں جھوٹی باتیں کہنے والا بھی۔ یہی پہچان ہوتی ہے عز وشرف والوں کی اور ان لوگوں کی جو دین میں اور اپنے علم وفضل میں بلندی پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

شاعر نے سچ کہا ہے:

ومن في الناس يرضى كل نفس
وبين هوى النفوس مدى بعيد؟

لوگوں میں کون ہے جو ہر کسی کو خوش رکھ سکے، کیونکہ لوگوں کی پسند وناپسند کے درمیان بہت فاصلے پائے جاتے ہیں۔

مغرب کے فکری غلام

مولانا مودودی کے ناقدین کی مختلف قسمیں ہیں: کچھ لوگ تنقید کرتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ ان کی دعوت اور فکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں مولانا مودودی کو ناپسند نہیں کرتے بلکہ خود اسلام کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس طرز پر سوچنے والے بہت سے لوگ ہیں، جو مغربی فکر کے غلام ہیں، لادین، مارکسی، اور اسلام دشمن، اور وہ تمام لوگ جو یہ نہیں چاہتے کہ اسلام کی حکومت قائم ہو جو شریعت الٰہی کو اپنا ماٗخذ قانون بنائے، جو ایک ایمانی معاشرہ قائم کرے، اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرے اور لوگوں کی اسلامی منہج کے مطابق تربیت کرے۔ ایک ایسی حکومت جو نہ زمین میں اپنی خدائی کا جھنڈا گاڑے، نہ فساد پھیلائے۔ وہ ایسی حکومت ہو، جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے۔

مولانا مودودی کا پہلا مقابلہ ایسے ہی لوگوں سے تھا، جو اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی ماننے سے انکار کرتے تھے، جن کی محبتیں اور وفاداریاں اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے بجائے دوسرے لوگوں کے لیے تھیں۔

مولانا مودودی سے ان لوگوں کا اختلاف بہت ہی بنیادی اور جوہری قسم کا تھا۔ یہ اختلاف سطحی اور معمولی قسم کا نہیں تھا، کیونکہ یہ عقائدی (نظریاتی) اختلاف تھا۔ یہ اصولوں اور بنیادوں کا اختلاف تھا نہ کہ فروعی اور جزوی امور کا اختلاف، اس کی مثال وہ قادیانی ہیں، جو نبوت کے نئے دعوے دار تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے قرآن وسنت، اجماعِ اُمت اور دین کی ان باتوں کا انکار کیا، جو دین کے مسلّمات میں سے ہیں۔ اللہ رب العزت نے محمد ﷺ کی نبوت کے ذریعہ سلسلۂ رسالت ونبوت پر مہر لگادی۔ محمد ﷺ کے بعد اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ قرآن مجید کے بعد کوئی کتاب آنے والی ہے، نہ اسلام کے بعد کوئی شریعت آنے والی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ اختلاف اس قدر شدید ہوگیا کہ امام مودودی کو پھانسی [۱۱ مئی ۱۹۵۳ء] کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اسی طرح مولانا مودودی کا اختلاف مغرب کے غلاموں، سیکولرزم کے علم برداروں سے بھی تھا، چاہے وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہوں یا بائیں بازو سے۔

ان لوگوں کی اندھی مخالفت نے مولانا مودودی کے عزوشرف کو چار چاند لگادیے۔ اور انھیں کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ یہ ساری مخالفتیں ان کے کارناموں اور ان کی نیکیوں کے رجسٹر میں درج کی جائیں گی، یہ لوگ اپنے باطل سے صرف اور صرف حق کی مخالفت کرتے رہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''تمھاری کامیابی کے لیے یہ کافی ہے کہ تمھارا دشمن، اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ جنگ ہے!''۔

بہت پہلے کسی شاعر نے کہا تھا:[۲۷]

لقد زادنی حبا لنفسی أننی
بغیض الی کل امرئ غیرطائل
وأنی شقی باللئام، ولاتری
شقیا بهم الا کریم الشمائل!

اس سے میری نگاہ میں میری قدر بہت بڑھ گئی کہ ہر ناکارہ انسان مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ کمینے اور ناہنجار لوگ میرے درپے آزار رہتے ہیں، یہ کمینے لوگ انھی لوگوں کے درپے آزار ہوتے ہیں، جو کریم الطبع اور نیک خصلت ہوتے ہیں!

تصوف کے دوکان دار

مولانا مودودی کے مخالفین میں وہ لوگ بھی تھے، جو اسلام کے نام کی روٹی کھاتے تھے، حالانکہ اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ وہ گمراہ لوگ تھے جو تصوف کے نام پر اپنی دوکانیں چلاتے اور مسلم عوام کو بے وقوف بناتے، ایسے ہی لوگوں کے سلسلے میں شاعر نے کہا تھا:[۲۸]

وقالوا سکرنا بحب الاله
وما أسکر القوم الا القصع!

اُنھوں نے کہا کہ ہمیں حب الٰہی کا نشہ ہے، حالانکہ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہیں!

اُنھوں نے اسلام میں وہ کچھ داخل کر دیا جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا، اس کے حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا، اس کی تعلیمات کو آلودہ کر کے رکھ دیا، اور اس کی توحید کو شرکیہ اعمال سے، اس کی عبادات کو بدعتوں سے اور اس کے اخلاق کو باطل پرستی کی کثافتوں سے بگاڑ کر رکھ دیا۔ ان میں سے کچھ تو بالکل جاہل تھے۔ وہ اس بات کے محتاج تھے کہ اسلام کو نئے سرے

۲۷۔ طرماح بن حکیم کے اشعار سے۔
۲۸۔ ابراہیم بن نصر موصلی کے اشعار سے۔

سے سمجھیں۔ کچھ دوسرے لوگ تھے، جو محض پیٹ کے بندے تھے، جو تصوف کو بس نام کی حد تک جانتے تھے، اس سے آگے کچھ نہیں جانتے تھے۔

وہ مولانا مودودی سے اس بات پر خار کھائے ہوئے تھے کہ وہ ان کے فریب کی قلعی کھول رہے تھے، اور ان کی جعل سازیوں سے پردہ اٹھا رہے تھے، اور ان کے مریدوں کو ان سے توڑ کر اس قافلے سے جوڑ رہے تھے جو عقل اسلام سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، وہ انھیں اس ریوڑ سے نکال رہے تھے جس کو خرافات، جہالت اور خوف کے ڈنڈوں سے ہانکا جاتا تھا۔

ثقافتی سطح کا فرق

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مولانا مودودی پر اس وجہ سے تنقید کرتے تھے، کہ وہ ان کو سمجھ نہیں پائے تھے، ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ثقافتی سطح اور مزاجی دلچسپیوں میں کافی فرق تھا۔ ساتھ ہی آپس میں حد سے بڑھی ہوئی بدگمانیاں حائل تھیں۔

اس کے علاوہ بعض بڑے بڑے علماء، جن کے بڑے بڑے تدریسی حلقے تھے، اُنھوں نے اپنے اپنے شاگردوں اور ارادت مندوں کے سامنے مولانا کے کاموں کے سلسلے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ وجہ ظاہر ہے، ان کا میدان کار مولانا مودودی کے میدان کار سے مختلف تھا، ان کی سوچ کا دائرہ مولانا مودودی کی سوچ کے دائرے سے مختلف تھا، ان کی منزل مولانا مودودی کی منزل سے مختلف تھی اور وہ ان فتنوں کا سامنا نہیں کر رہے تھے جن کا سامنا مولانا مودودی کر رہے تھے۔

یہ لوگ ان کی لغزشیں تلاش کرتے تاکہ ان کو ہولناک بنا کر پیش کر سکیں، یہ لوگ مولانا کی ان باتوں پر پکڑ کرتے جو انھوں نے کہی نہیں، بلکہ ان کی کہی ہوئی باتوں سے نتیجہ اخذ کرتے، اور اسی پر ان کا محاسبہ کرتے۔

ہم نے ان کے بیش تر اعتراضات دیکھے ہیں، ان کی آسانی سے تاویل کی جا سکتی ہے، اور ان کو صحیح معنی پہنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ درمیان میں حسن ظن موجود ہو۔ حسن ظن تو ایک عام

مسلمان کے سلسلے میں بھی مطلوب ہے، چہ جائیکہ کوئی ایسا شخص ہو جس نے اپنے آپ کو اسلام کے دفاع کے لیے وقف کر رکھا ہو، اور بحیثیت ایک مکمل نظام زندگی اسلام کی طرف دعوت دینے کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہو!

استاذ مودودی پر تنقید کرنے والے ایسے لوگ بھی تھے، جن کا ذہنی افق بہت تنگ تھا، وہ جمود کا شکار تھے یا اندھی تقلید کرنے والے تھے، یا پھر وہ لوگ تھے جو کسی ایک نقطہ نظر کے سلسلے میں سخت تعصب کا شکار ہوتے ہیں، گرچہ ان میں سے بہت سے لوگوں کے اخلاص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تماشے ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں، یہاں تک کہ بڑے بڑے ائمہ کے ساتھ بھی ایسے واقعات پیش آئے۔ کہا جاتا ہے کہ امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معین نے امام شافعی پر کلام کیا، اور کہا: ''وہ ثقہ نہیں ہیں۔''

یہ بات امام احمد بن حنبل تک پہنچائی گئی تو انھوں نے کہا: ''یحییٰ بن معین کو کیا معلوم کہ شافعی کیا تھے؟! وہ نہ شافعی کو جانتے ہیں، نہ شافعی کی باتوں کو سمجھتے ہیں! جو شخص کسی چیز کو سمجھتا نہیں، وہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے!''[۲۹]

یہ واقعہ پیش آیا، حالانکہ یحییٰ اپنے فن کے امام تھے، اور وہ احمد بن حنبل کے قریب ترین لوگوں میں سے تھے۔ علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں: ''امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے سچ کہا، ابن معین، شافعی کی باتوں کو نہیں سمجھتے تھے!''، ابن معین کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے تیمم سے متعلق ایک سوال کیا گیا، تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکے۔[۳۰]

۲۹۔ ابن جنید کے سوالات میں مذکور ہے: میں نے یحییٰ بن معین سے سوال کیا: ''آپ کی کیا رائے ہے اگر کوئی شخص کسی کے اجتہاد پر عمل کرے؟'' انہوں نے کہا: ''کس کا اجتہاد؟'' میں نے کہا: ''امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کا؟'' انھوں نے کہا: ''میں کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ وہ شافعی کے اجتہاد پر عمل کرے، شافعی کے اجتہاد پر عمل کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ابوحنیفہ کے اجتہاد پر عمل کیا جائے''، ص: ۲۹۵/، البتہ بعض علماء نے یحیی بن معین کی جانب اس قول کی نسبت میں شک کا اظہار کیا ہے۔ دیکھیں: تہذیب التہذیب: جلد ۹/صفحہ ۲۵، اور جامع بیان العلم وفضلہ: جلد دوم، ص ۳۱۰۔

۳۰۔ جامع بیان العلم وفضلہ: جلد دوم، ص ۳۱۰۔

اس سے معلوم ہوا کہ ثقافتی سطح کا فرق اور دلچسپیوں کا اختلاف افراد کے بارے میں فیصلے پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے، بلاشبہہ ابن معین کا وہ میدان نہیں تھا، جو شافعی کا تھا، اور ان کی وہ دُنیا نہیں تھی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

اسی لیے ہمیں ان زیادتیوں اور ان جارحانہ کارروائیوں پر کوئی تعجب نہیں جو اہل حدیث اور اہل رائے نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیں۔ جن سے جرح و تعدیل اور تراجم و طبقات کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اہل حدیث حضرات نے تو اصحاب رائے اور ان کے مشہور امام ابوحنیفہ نعمان رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں جارحیت کی حد کر دی!

جو شخص بھی اہل حدیث حضرات کی ان تنقیدوں بلکہ ان الزامات اور بہتان تراشیوں کا مطالعہ کرے گا، جو امام ابوحنیفہ کے تعلق سے روا رکھی گئیں، وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلمان بھی ایسی بات کہہ سکتا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ یہ باتیں مسلم عوام میں نہیں پھیل سکیں۔ عمومی طور پر عقل اسلامی نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا، اور انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے تاریخ کے ملبے میں دفن کر دیا، ان پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ عزت و اکرام کی بلندیوں پر خیمہ زن رہے، کروڑوں مسلمان ان کے فقہی اجتہادات کے دل دادہ ہیں اور دُنیا بھر میں لوگ ان کے علم سے سیراب ہو رہے ہیں۔

حافظ ابوعمر بن عبدالبر اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں لکھتے ہیں:

> اہل حدیث حضرات نے ابوحنیفہ کی مذمت میں افراط سے کام لیا ہے اور اس میں حدود سے تجاوز کر گئے، ان کے اس رویے کا اصل سبب ان کے بقول یہ تھا کہ وہ روایات کے ہوتے ہوئے بھی رائے اور قیاس کو ترجیح دیتے تھے اور ان کا اعتبار کرتے تھے، جبکہ اکثر اہل علم کا کہنا تھا کہ اگر روایت صحیح ہے تو قیاس اور رائے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ابوحنیفہ محتمل تاویلات کی بنیاد پر اخبار آحاد کو ردّ کر دیا کرتے تھے۔
>
> قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ان کے یہاں بہت سی ایسی رائیں تھیں، جو ان کے متقدمین

کے ہاں بھی ملتی ہیں، اور ان کے بعد بھی اصحاب رائے کا ایک گروہ اس طرح کی رائیں رکھتا رہا ہے۔ ان باتوں کا بڑا حصّہ وہ تھا جو وہ اپنے علاقہ کے علماء کی اتباع میں کہا کرتے تھے، یعنی ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دیگر تلامذہ کی اتباع میں۔[31]

معاصرین کا حسد

مولانا مودودی کے ناقدین میں ایسے لوگ بھی تھے، جو ان پر حسد اور جلن کی وجہ سے تنقید کرتے تھے۔ انسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ یہی حال ہوتا ہے، کیونکہ وہ آلودگیوں سے پاک فرشتے تو نہیں ہیں۔ ایسا عموماً وقتی اشتعال اور فوری غصّے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، اور صحیح فیصلے نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ غصّے سے ہوشیار رہنے کو کہا گیا ہے، متفق علیہ روایت ہے:

لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ

کوئی بھی حاکم یا قاضی غصے کی حالت میں دو انسانوں [یا دو فریقوں] کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔[32]

اس طرح کی جارحیت بسااوقات کسی اندرونی حسد کی وجہ سے ہوتی ہے، خاص طور سے معاصرین میں یہ بیماری عام ہوتی ہے۔ سلف کے بارے میں اس طرح کے معاصرانہ حسد کے بہت سے قصّے منقول ہیں، حالانکہ علم وفضل کے اعتبار سے ان کا رتبہ معلوم ہے، پھر اپنے زمانے کے لوگوں کو کیا کہا جائے؟

حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک باب قائم کیا ہے: ''**حکم قول العلماء بعضھم فی بعض**'' علماء نے آپس میں جو ایک دوسرے پر تنقیدیں کی ہیں، ان کا کیا حکم ہوگا؟، اس باب کا آغاز انھوں نے اس حدیث نبوی سے کیا ہے:

۳۱۔ جامع بیان العلم وفضلہ: جلد دوم، ص ۲۸۹

۳۲۔ متفق علیہ، اس کی روایت بخاری نے کتاب الاحکام (۷۱۵۸) میں اور مسلم نے کتاب الاقضیۃ (۱۷۱۷) میں کی ہے، اس کے راوی ابوبکرہ ہیں۔

تمھارے اندر تم سے پہلے کی قوموں کی بیماریاں داخل ہوگئیں، حسد اور باہمی نفرت، نفرت مونڈ دینے والی بیماری ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بال مونڈتی ہے، بلکہ یہ دین کو مونڈ کے رکھ دیتی ہے![۳۳]

حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ

علماء کے علم کو غور سے سنو، لیکن ایک دوسرے کے بارے میں ان کی تنقیدوں پر دھیان نہ دو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ لوگ جنگلی بکروں سے بھی زیادہ باہم لڑنے والے ہیں۔[۳۴]

اُنھوں نے مختلف اہل علم کی آپس میں ایک دوسرے پر تنقیدوں کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، ہم میں سے کوئی انھیں پڑھے تو تعجب کرے کہ یہ عظماء ایسی باتیں کیسے کر سکتے ہیں! حقیقت یہ ہے کہ کمال تو اللہ ہی کے لیے ہے اور معصوم تو رسول پاک ﷺ کی ہی ذات ہے، جن کے بارے میں قرآن مجید کی گواہی ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم ۶۸:۴) اور بے شک تم اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہو۔

ہم نے اس کے کچھ نمونے خطیب بغدادی کی کتاب تاریخ بغداد میں دیکھے ہیں، جہاں اُنھوں نے امام ابوحنیفہ کے تعلق سے بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کیے ہیں، جن کو پڑھ کر بدن کانپ اُٹھتا ہے۔

چنانچہ اسی چیز نے علامہ کوثری کو مجبور کیا کہ وہ اس پر ایک کتاب لکھیں، جس کا نام ہے: تأنیب الخطیب علی ماساقہ فی حق ابی حنیفۃ من الأکاذیب یعنی خطیب

۳۳۔ اس کی روایت امام احمد نے کی ہے، اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس کی سند منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، ترمذی نے اس کو باب فی صفۃ القیامۃ میں اور ابن عبدالبر نے اس کو جامع بیان العلم وفضلہ میں بیان کیا ہے، البانی نے صحیح الترغیب والترہیب (۳/۶۱) میں اس کو حسن لغیرہ قرار دیا ہے، اس کے راوی زبیر بن العوام ہیں۔

۳۴۔ جامع بیان العلم وفضلہ: ۲۱۲۳

بغدادی کی سرزنش امام ابوحنیفہ کے تعلق سے جھوٹی باتیں اپنی کتاب میں درج کرنے پر۔

میں نے کتاب السنة پڑھی، جو امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ کی جانب منسوب ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر میں حیران رہ گیا، کہ اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کے تعلق سے ایسی ایسی باتیں تھیں، جنھیں پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک عالم کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکل سکتی ہیں! اس کتاب میں اُمت مسلمہ پر بھی تہمت لگائی گئی ہے کہ: 'اس پر باطل کا جادو چل گیا، اور اس نے ایک ایسے شخص کو اپنا امام بنالیا، جس کے پاس نہ دین ہے، نہ علم!'

ائمہ اسلام میں سے کوئی بھی امام ایسا نہیں گزرا جس کی شخصیت پر کسی نہ کسی بہانے سے دھول نہ اُڑائی گئی ہو، یا اسے تنقیدوں کا نشانہ نہ بنایا گیا ہو۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: جو شخص امام مالک، امام شافعی اور ان جیسے ائمہ کو نشانۂ تنقید بناتا ہے، اس کا حال وہی ہوتا ہے جو اعشیٰ نے بیان کیا ہے:

كناطح صخرة يوما ليوهنها
فلم يضرها، وأوهى قرنه الوعل!

اس پہاڑی بکرے کی طرح جو چٹان کو سینگ مارتا ہے کہ اسے کمزور کردے، لیکن وہ اس کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچا پاتا، البتہ وہ خود اپنی سینگ کمزور کر لیتا ہے!

یا جیسا کہ حسین بن حمید نے کہا:

يا ناطح الجبل العالي ليكلمه
أشفق على الرأس لاتشفق على الجبل!

اے بلند پہاڑ کو سینگیں مارنے والے تاکہ اسے زخمی کردے، اپنے سر پر رحم کر، پہاڑ پر رحم نہ کر۔

اس سلسلے میں ابوالعتاہیۃ نے بھی خوب کہا ہے:

ومن ذا الذی ینجو من الناس سالما

وللناس قال بالظنون وقیل

لوگوں سے کون صحیح سالم بچ کر نکلا ہے، لوگ تو محض ظن کی بنیاد پر تبصرے کرتے ہیں، اور دوسروں کے تبصرے بیان کرتے ہیں۔

ابوعاصم نبیل سے کہا گیا: فلاں شخص امام ابوحنیفہ پر تنقیدیں کرتا ہے!

اُنھوں نے کہا: نصیب نامی شاعر نے غلط نہیں کہا ہے:

سلمت؟ وهل حیّ علی الناس یسلم؟!

کیا تم محفوظ رہ گئے؟ کیا لوگوں کے درمیان کوئی زندہ انسان ان کی تنقیدوں سے محفوظ رہ سکتا ہے؟

ابوالاسود الدوَلی نے کہا تھا:

حسدوا الفتی اذ لم ینالوا سعیه

فالناس أعداء له وخصوم!

جب لوگ اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکے اس کی سعی و جہد میں، تو اس سے حسد کرنے لگے، چنانچہ لوگ اس کے دشمن ہیں، اور اس سے جھگڑتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب، میرے تعلق سے بنی اسرائیل کی زبان بند کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ، میں نے اپنے بارے میں تو ان کی زبانیں بند نہیں کیں، تو تمھارے بارے میں کیسے بند کر دوں؟ [۳۵]

یہ چند حوالے ہیں، جو ابن عبدالبر نے علماء کی باہمی رنجشوں اور آویزشوں سے متعلق بیان

۳۵۔جامع بیان العلم وفضلہ: جلد دوم، ص ۳۱۲

کیے ہیں۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جو ہمارے زمانے سے بہتر زمانہ تھا، اور ان لوگوں کی باتیں ہیں جو ہمارے معاصرین سے بہتر لوگ تھے۔ پھر اپنے زمانے اور اہل زمانہ کو کیا کہا جائے! جس میں انصاف عنقا ہے اور ہر طرف کجی اور ظلم وزیادتی کا دور دورہ ہے!

جزوی مسائل میں اختلاف

مولانا مودودی پر تنقید کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو ان کی بعض رایوں اور بعض اجتہادات سے اختلاف رکھتے ہیں، لیکن ان کی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے اختلاف کو اس طرح پیش کرتے ہیں، گویا وہ اسلام کی مخالفت ہو۔

وہ بس اپنے آپ کو اسلام کا نمائندہ اور اس کا مسلّمہ ترجمان سمجھتے ہیں، کہ ان کے قول کے ہوتے ہوئے کسی اور قول کی گنجائش نہیں، ان کے فکر کے علاوہ کوئی اور فکر قابل قبول نہیں۔

بدقسمتی سے یہ لوگ عموماً جزئیات اور کلیات میں فرق نہیں کرتے۔ ایک یا دو یا تین جزئی مسائل میں اختلاف ان کے ہاں ایسی آگ بھڑکا دیتا ہے، جو کسی صورت بجھنے کا نام نہیں لیتی۔

اگر مولانا مودودی نے کسی حدیث کی تاویل کی، یا کسی قدیم رائے سے اختلاف کیا، یا کسی مسئلے میں مشہور رائے قبول نہیں کی، تو یہ لوگ ان کے خلاف تہمتوں کا بازار گرم کر دیتے، ان کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلاتے، اور ان کی مذمت اور غیبت کے لیے زبانیں بے لگام چھوڑ دیتے!

مختصر یہ کہ ان کے ساتھ وہی کچھ کرتے جو اس سے قبل لوگوں نے امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

کے ساتھ کیا تھا۔ دونوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اپنے اجتہاد اور رائے کی بنیاد پر احادیث اور آثار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہنے والے تو یہاں تک کہہ گئے، کہ:

اگر امام ابوحنیفہ اپنے اجتہادات اور قیاس کے بجائے اس اُمت پر تلوار لے کر چڑھ

دوڑتے تو اُمت کو اتنا نقصان نہ پہنچتا![36]

۳۶۔ ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ: ۲/۲۸۸۔

کچھ لوگوں نے تو امام مالک بن انسؒ کے بارے میں ''مصالح مرسلہ'' کا اعتبار کرنے کی وجہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ ''انھوں نے اپنی گردن سے اسلام کا طوق نکال دیا''۔[37]

یعنی وہ شرعی نصوص کی پابندی سے آزاد ہو گئے۔ کیا بات کہہ دی لوگوں نے اور کیسا بھیانک الزام لگایا ظالموں نے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے افکار ونظریات کے لیے نہایت متعصب ہوتا ہے، اور دوسروں کے افکار ونظریات کے سلسلے میں بدگمانی سے کام لیتا ہے۔

مان لیجیے، مولانا مودودی نے بعض جزئی مسائل میں غلطی کی، یا ان کی صحیح صحیح تعبیر نہ کر سکے، جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے، تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی امامت سے انکار کر دیا جائے، ان کی عدالت کو لہولہان کر دیا جائے، اور ان کے دین اور ان کے فکر پر شب خون مارا جائے؟

کس عالم سے لغزش نہیں ہوئی ہے، اور کون سا اصیل گھوڑا ہے جو ٹھوکروں سے محفوظ رہا ہے؟ معصوم تو وہی رہ سکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں ہو، اور یہ مقام بس نبی ﷺ کا تھا!

اس سے بھی زیادہ واضح مثال شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ہے۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ 'اجماع' کا انکار کرتے ہیں، صحابہ کرام اور ائمہ مذاہب کی مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تمام دعوے غلط اور ناقابل یقین تھے، لیکن انھی غلط دعووں کی بنیاد پر ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، ان کو ستایا گیا، اور ایک سے زائد بار انھیں جیل جانا پڑا، اور جیل میں ہی ان کی وفات ہوئی۔

بعض افکار میں کچھ بڑوں کا اختلاف

مولانا مودودی پر تنقید کرنے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں، جو بعض مسائل اور موضوعات

پر ان سے فکری اختلاف رکھتے تھے۔ ان کا یہ اختلاف محض نقطہ نظر کا اختلاف تھا، ورنہ وہ ان کی

۳۷۔ الاعتصام جلد سوم، ص ۳۹، دارابن الجوزی، طبع اولیٰ: ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۰۰۸ء

قدر و منزلت کو تسلیم کرتے، اور ان کی نیک نیتی کا اعتراف کرتے تھے۔

مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں پر مولانا ابوالاعلیٰ نے جو تنقید کی ہے، اسلام کے پیغام کو جس مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے، دشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈوں کا جس مدلل اور مؤثر طریقے سے جواب دیا ہے، اور ان کے افکار و رجانات کا جس طرح محاکمہ کیا ہے، ان تمام پہلوؤں سے وہ مولانا کی خداداد صلاحیت کے قائل تھے۔ ان کا اختلاف کوئی بڑا اختلاف نہیں تھا، وہ محض چند علمی مسائل، کچھ فکری اُمور، یا پھر تحریک اسلامی کے عمومی طریقہ کار سے متعلق تھا۔

اس قسم کے اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہے، لوگ اس طرح کا اختلاف ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ ہر ایک کا اِک نقطہ نظر ہوتا ہے، جس کے مطابق وہ چلتا ہے، ہر مجتہد کا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ صحیح اجتہاد کرنے والے کو اجر ملے گا، اجتہاد میں غلطی کرنے والا معذور سمجھا جائے گا، بلکہ اسے بھی اَجر ملے گا، گرچہ اس کا اَجر صحیح اجتہاد کرنے والے سے کم ہوگا۔

سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید

میں سمجھتا ہوں عظیم اسلامی داعی علامہ سیّد ابوالحسن علی ندویؒ اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مولانا مودودی کی بعض تحریروں پر، بالخصوص ان کی کتاب 'قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں' پر جو تنقید کی ہے، وہ اسی نوعیت کی ہے۔

میں یہاں ان دونوں عظیم شخصیات کے درمیان فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، تاہم یہاں صرف تین باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں:

پہلی بات جو میں نے علامہ ابوالحسن علی ندوی سے اس وقت کہی تھی، جب دولت قطر کے

دارالحکومت دوحہ میں سیرت رسولؐ اور سنت نبویؐ پر منعقد تیسری کانفرنس کے دوران میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ ندویؒ نے علامہ مودودیؒ پر اپنی تنقیدی کتاب کا عربی نام رکھا تھا 'التفسیر السیاسی للاسلام'۔ میں نے علامہ ندوی سے کہا: ''اس نام میں شدت پائی جاتی ہے، اور اس سے وہ کچھ سمجھا جاسکتا ہے جو آپ کا مقصود نہیں ہے۔''

یہ علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کی انصاف پسندی تھی کہ اُنھوں نے اس بات سے اتفاق کیا، اور فرمایا: ''کاش، کتاب کی اشاعت سے پہلے میرے کانوں میں آپ کی یہ بات پڑ جاتی''۔ اُنھوں نے اس بات کا بھی اندیشہ ظاہر کیا کہ ''اس سے عرب ممالک میں وہ لوگ ناجائز فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو سیاست کو دین سے جدا کردینے کا نعرہ لگاتے ہیں!''

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہندستان میں بھی کسی نے ان کو اس طرف توجہ دلائی تھی، چنانچہ جب اردو میں یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کا نام تبدیل کردیا گیا۔[۳۸]

دوسری چیز جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے وہ نتائج اخذ کیے، جو خود مولانا مودودی نے نہیں لکھے۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں یہ گنجائش موجود ہے کہ ان سے وہ نتائج اخذ کیے جاسکیں۔

اُمت کے محقق علماء کے یہاں یہ معروف قاعدہ ہے کہ ''مذہب سے لازم آنے والی چیز مذہب نہیں شمار ہوگی''۔ اور کوئی بھی عالم صرف انھی افکار و خیالات کا ذمہ دار ہوگا، جن کی وہ صراحت کرے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک عالم ایک رائے اختیار کرتا ہے، اس پر اس کو اطمینان ہوتا ہے، اس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے، لیکن اس سے لازم آنے والے نتائج اس کے ذہن میں نہیں ہوتے۔

لہٰذا، اگر کہیں ہم دیکھتے ہیں، کہ کچھ غالی اور انتہا پسند لوگ تکفیر کا فتنہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں، وہ اس فکری انتہا پسندی اور مذہبی غلو کے لیے علامہ مودودی کے کچھ الفاظ، اور بعض عبارتوں کا سہارا لیتے ہیں، اور وہ بے دھڑک تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں، تو اس کی ذمہ

داری مولانا مودودی پر ہرگز نہیں آتی۔ اس لیے کہ علامہ مودودی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کا وہ مقصد نہیں تھا، جو ان لوگوں نے سمجھا ہے۔ عقیدہ وعمل کے سلسلے میں وہ جن نتائج تک جا پہنچے، علامہ مودودی کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ نتائج نہیں تھے۔

اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو بھی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے رہے ہیں، آج بھی کرتے ہیں

۳۸۔ اردو میں اس کتاب کا نام عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح رکھا گیا۔ مترجم

اور پہلے بھی کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے نہ تو کلام الٰہی میں عیب لازم آتا، نہ کلام رسول میں، بلکہ اس سے اس شخص کا عیب ظاہر ہوتا ہے جس نے کلام کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس کی عقل انحراف کا شکار ہوگئی، وہ ان لوگوں میں شامل ہوگیا جو کلام کو اس کے سیاق سے الگ کرکے اسے غلط معنی پہناتے ہیں! ابوالطیب نے صحیح کہا ہے:

وکم من عائب قولا صحیحا

وآفته من الفهم السقیم

کتنے ہی لوگ ہوتے ہیں جو صحیح بات میں عیب نکالتے ہیں، حالانکہ ان کی آفت ان کا مریض فہم ہوتا ہے!

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

ومن یک ذا فم مر مریض

یجد مرا به الماء الزلالا

جس کا منہ بیمار اور کڑوا ہوگا، وہ میٹھے اور خوش ذائقہ پانی کو بھی کڑوا پائے گا!

تیسری بات جو ہمیں کہنی ہے، وہ علامہ مودودی کی عالی ظرفی سے تعلق رکھتی ہے۔ علامہ ابوالحسن علی ندوی نے علامہ مودودی کی کتاب پر تنقید کی، علامہ مودودی نے اس کا برا نہیں مانا، نہایت خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا۔ یہی ایمان داری، یہی خاکساری، اور یہی انصاف پسندی ان جیسے عظما کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔

علامہ مودودی کی وفات کے موقع پر ماہنامہ البعث الاسلامی جو دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، بھارت کا ترجمان ہے، اس میں علامہ ندوی کا جو تعزیتی پیغام شائع ہوا تھا، اس میں اس بات کا انکشاف تھا کہ علامہ مودودی نے ان کی تنقید کا خیر مقدم کیا، اس پر ان کا شکریہ ادا کیا، اور خواہش ظاہر کی کہ: ''کاش آپ اسی طرح ہماری تمام تالیفات پر اپنے تبصرے لکھ ڈالتے!''

صحیح بات ہے، علم میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، مومن اپنے بھائی کے لیے آئینہ ہوتا ہے، اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عمارہ کی تنقید

کفر اور جاہلیت پر امام مودودی نے جو کچھ لکھا اور کہا ہے، اس پر تنقید کرنے والوں میں ایک مصری اسلامی مفکر ڈاکٹر محمد عمارہ بھی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امام مودودی نے موجودہ مسلم معاشرے پر جو حکم لگایا ہے اس میں غلو سے کام لیا ہے۔ اُنھوں نے موجودہ مسلم معاشرے کے ساتھ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو بھی لپیٹ لیا ہے، اور ان سب کو جاہلیت زدہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمارہ اس کو ایک بے وزن بات قرار دیتے ہیں۔ اُنھوں نے رمضان ۱۴۲۴ھ میں منعقد 'اقرأمیڈیا سیمینار' میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

> ابوالاعلیٰ مودودی نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد پر قائم معاشروں کی بات تو درکنار، اسلامی معاشروں اور اسلامی ممالک میں بھی حاکمیت الٰہ کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ پھر اُنھوں نے تمام اسلامی معاشروں اور ان کی حکومتوں پر جاہلیت، بالفاظ دیگر کفر کا حکم لگا دیا۔ البتہ، اُنھوں نے افراد اور اُمت پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا۔ تاہم ، اُنھوں نے یہ ایک بے وزن بات کہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری برسوں ہی سے اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب پر جاہلیت کی حکمرانی در آنے لگی تھی۔

مغربی جاہلیت کو امام مودودی نے 'خالص جاہلیت'، 'نئی جاہلیت'، 'معاصر جاہلیت' اور 'متمدن جاہلیت' قرار دیا۔

اُنھوں نے لکھا ہے کہ ہماری اسلامی تہذیب، اور ہماری اُمت کی اسلامی ثقافت، اوراسلامی اجتماعی نظام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور ہی سے جاہلیت کی طرف پلٹنا شروع ہو گیا تھا۔

امام مودودی کہتے ہیں جن مقاصد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، ان کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے راستے پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی چل کر دکھایا:

> پھر زمام قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی، اور ابتداً چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جمارہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا۔ دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن پر اس کارِعظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش روؤں کو عطا ہوئی تھیں۔ (بعض مفتیانِ کرام نے اس فقرے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توہین کا پہلو نکالا ہے۔ حالانکہ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں بعض اُن اوصاف حکمرانی کی کمی تھی، جو سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ عنہما میں بدرجۂ کمال پائے جاتے تھے۔ یہ تاریخ کا مسئلہ ہے، جس کے بارے میں تاریخ کے طالب علم مختلف راہیں ظاہر کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی فقہ وکلام کا مسئلہ نہیں ہے)۔ اس لیے ان کے زمانہ خلافت میں جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا موقع مل گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رُکا۔
>
> اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور اُنھوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی، مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس (counter revolution) کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا۔ ملک عضوض (tyrant kingdom) نے اس کی جگہ لے لی، اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوئی۔[۳۹]

امام مودودی آگے چل کر 'جاہلیت' کی طرف ارتداد سے متعلق مزید لکھتے ہیں:

پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہو، اور علوم وفنون بھی اسی طرز پر مرتب ومدون ہوں۔"[40]

پھر اپنی ایک اور کتاب 'اسلامی ریاست' میں لکھتے ہیں:

۳۹۔ تجدید واحیائے دین، ص: ۲۹، ناشر: اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
۴۰۔ ایضاً، ص ۳۱

وہ ممالک اور وہ حکومتیں جو غیر اسلامی بنیادوں پر قائم تھیں، ان کو آپ اسلامی ممالک اور اسلامی حکومتوں کا نام دیتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ ان کے حکمراں مسلمان تھے۔ وہ تہذیب جو قاہرہ، دہلی، بغداد اور قرطبہ کے شاہی محلات اور دنیوی عیش وآرام کے ٹھکانوں میں پروان چڑھی، اس کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں، حالانکہ اس میں نہ تو اسلام کا کوئی عمل دخل تھا اور نہ اس کا اسلام سے کوئی رشتہ تھا۔۔ جب آپ اسلامی تاریخ کے عظیم کارناموں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں تو عباسیوں، سلاجقہ اور مغلوں کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہیں، حالانکہ تاریخ کو صحیح اور اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو وہ جرائم کے رجسٹر میں سیاہ روشنائی سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔[41]

انصاف کی بات

اس میں شبہہ نہیں کہ مولانا مودودی نے مغربی تہذیب پر جاہلیت کا جو حکم لگایا ہے، اس تہذیب کے عام رجحان اور اس کے جسم میں دوڑنے والی روح کو دیکھتے ہوئے وہ بالکل صحیح ہے۔ اس کی صورت حال علامہ محمد اسد [سابق، لیوپولڈ ویس، م: ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء] کے بقول کچھ اس طرح ہے کہ: ''اس نے اپنے موجودہ فکری نظام میں اللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی ہے، اور اس کا عام فلسفہ ظالم مادہ پرستی، انتہائی فحاشی اور حد سے بڑھی ہوئی نفع اندوزی پر قائم ہے۔ اخلاقی قدروں کے لیے نہ تو اس کی معیشت میں کوئی جگہ ہے، نہ اس کی سیاست میں، نہ جنگی حالات میں اور نہ امن وسکون کے حالات میں۔ اس تہذیب میں ان تمام چیزوں کی بنیاد اس اصول پر

ہوتی ہے کہ 'مقصد وسیلہ کو جائز کر دیتا ہے' یا 'وسیلہ مقصد کے تابع ہوتا ہے۔''

البتہ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کے تعلق سے مولانا مودودی کا حکم سخت ہی نہیں بلکہ بہت ہی سخت ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'تاریخنا المفتری علیه' میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

۴۱۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، 'اسلامی ریاست' اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

اس کتاب میں مَیں نے اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کے اس تجزیے پر تنقید کرتے ہوئے بہت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ میں نے اس میں لکھا ہے کہ ''مولانا مودودی اور دوسرے اہل قلم اور اسلامی مفکرین، مثلاً سیّد قطب شہید، شیخ محمد الغزالی اور سید ابوالحسن علی ندوی بہت حد تک ہمارے ان تاریخی مصادر سے متأثر ہیں، جو ہماری تاریخ کی وہ تصویر پیش کرتے ہیں، جس میں سچائی کا عنصر مجروح ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں، میں نے مسلم مؤرخین، علماء حدیث، اور ادب کی تاریخ لکھنے والوں کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا کہ انھوں نے یہ تصویر اس قدر بگاڑ کر پیش کی ہے، کہ جس سے ہماری تاریخ کے تعلق سے وہ تأثر عام ہوا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''[۴۲]

البتہ امام مودودی غفر اللہ کے یہاں ہماری تاریخ کے حوالے سے سب سے سخت عبارتیں ملتی ہیں اور ان کے یہاں اس معاملے میں زیادہ جوش پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلو سے ڈاکٹر محمد عمارہ کی مولانا مودودی پر تنقید بھی بہت سخت ہوگئی ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ان کی حمایت میں لکھتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی کا خیال ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں ہی جاہلیت مسلم اُمت پر حملہ آور ہوئی، اور اس نے اس دور کو اسلامی رُخ سے ہٹا کر دوسرے رُخ پر ڈال دیا۔ حالانکہ یہ وہ ادوار ہیں، جن کے بارے میں مشہور صحیح احادیث آئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس اُمت کی بہترین صدیاں ہیں، فرمان رسول ﷺ ہے:

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرنی، ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُمْ، ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُمْ
سب سے بہترین دور میرا ہے، پھر جو لوگ ان کے بعد آئیں گے، پھر جو لوگ ان کے بعد آئیں گے[43]

۴۲۔ تاریخنا المفتری علیہ: ص۴۶ / اور اس سے آگے کے صفحات۔

۴۳۔ عمران بن حصین کی یہ روایت متفق علیہ ہے، اس کو بخاری نے باب الشہادات (۲۶۵۱) میں، مسلم نے فضائل الصحابہ (۲۵۳۵) میں، احمد بن حنبل نے اپنی مسند (۱۹۸۲۰) میں، ابوداؤد نے اپنی سنن (۴۶۵۷) میں، ترمذی نے کتاب الفتن (۲۲۲۲) میں، نسائی نے کتاب الایمان والنذ ور (۳۸۰۹) میں ذکر کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کے اثرات ان صدیوں یا ان زمانوں میں بہت گہرے اور مضبوط تھے۔ اسی عرصے میں مشرق ومغرب میں زبردست فتوحات حاصل ہوئیں، اور اسی عرصے میں بہت سی قومیں اسلام میں داخل ہوئیں۔ ان فتوحات میں بنوامیہ کا جو بڑا کردار رہا ہے، اس کا انکار کوئی ضدی اور ہٹ دھرم ہی کرسکتا ہے۔ انھی کے زمانے میں اسلام مشرق میں ہندستان، سمرقند، اور چین اور مغرب میں اندلس (اسپین) تک پھیلتا چلا گیا۔

اس روح کو دیکھیے جس روح کے ساتھ امام مودودی نے اسلامی تہذیب پر یہ بحث کی ہے اور اس روح کو بھی سامنے رکھیے، جس روح کے ساتھ ایک دوسرے علامہ اور داعی اسلام ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی خوب صورت تصنیف 'من روائع حضارتنا' لکھی ہے، جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ اس تہذیب کے کیا کیا کارنامے ہیں اور مسلمانوں اور عام انسانوں کے لیے اس کی کتنی گراں قدر خدمات ہیں۔

کسی تحریر کو دوسری تحریروں کی روشنی میں دیکھنا

میں ہمیشہ اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ مولانا مودودی کی کسی ایک تحریر کی بنیاد پر ان کے سلسلے میں کوئی بات نہ کہی جائے، ہم اس وقت تک ان پر کوئی حکم نہ لگائیں جب تک ان کی تمام تحریروں کو نہ دیکھ لیں۔ کیونکہ جس بات کو وہ ایک جگہ مطلق انداز میں لکھتے ہیں، اسی بات کو

دوسری جگہ کچھ شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں۔جس بات کو وہ ایک جگہ عموم کے ساتھ لکھتے ہیں،اسی بات کو دوسری جگہ خاص کر دیتے ہیں۔جس بات کو وہ ایک خطاب میں مجمل طور پر کہتے ہیں،اسی بات کو وہ دوسری کتاب یا خطاب یا تحریر میں مفصل انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اگر ہم کتاب الٰہی کو سمجھنے میں اس بات کا خیال رکھتے ہیں،تو اللہ کے بندوں کے کلام کو سمجھنے، یا اس کے سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر کرتے وقت کیوں نہیں اس بات کا خیال رکھتے ہیں؟

میں چاہتا ہوں کہ انصاف پسند اور سوجھ بوجھ سے کام لینے والے قارئین دیکھیں کہ امام مودودی جہاں ایک طرف اپنی کتاب 'تجدید و احیائے دین' میں اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ پر سخت گرفت کرتے ہیں، وہیں وہ 'مجددین کی ضرورت' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

اگرچہ یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس طغیان، جاہلیت میں اسلام بالکل ختم ہو گیا تھا اور جاہلیت کلیۃً غالب آ گئی تھی۔واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں اسلام سے متأثر ہو چکی تھیں، یا بعد میں متأثر ہوئیں،ان کی زندگیوں میں اسلام کا اصلاحی اثر تھوڑا یا بہت ہمیشہ موجود رہا۔

یہ اسلام ہی کا اثر تھا کہ بڑے بڑے جبار و غیر ذمہ دار بادشاہ بھی کبھی کبھی خوف خدا سے کانپ اٹھتے تھے اور راستی و انصاف کا طریقہ اختیار کر لیتے تھے۔

یہ اسلام ہی کی برکت ہے کہ بادشاہی کی سیاہ تاریخ میں ہم کو جگہ جگہ نیکی اور اخلاق فاضلہ کی روشنی چمکتی نظر آتی ہے۔یہ اسلام ہی کا طفیل ہے کہ جن شاہی خاندانوں میں خدائی کا رنگ جما ہوا تھا،ان کی آغوش میں بہت سے دین دار، عادل اور متقی انسان پیدا ہوئے اور انھوں نے شاہی اختیارات رکھنے کے باوجود حتی الامکان ذمہ دارانہ حکومت کی۔

اسی طرح امارت و ریاست کے ایوانوں میں، فلسفہ وحکمت کے مدرسوں میں، تجارت وصنعت کی کارگاہوں میں، ترک وتجرید کی خانقاہوں میں، اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام اپنے بالواسطہ اثرات کم وبیش برابر پہنچاتا رہا،اور عوام کے اندر بھی مشرکانہ جاہلیت کی دراندازی کے باوجود اس نے اعتقاد، اخلاق اور معاشرت میں

اصلاحی اور انسدادی دونوں حیثیتوں سے اپنا نفوذ جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے مسلمان قوموں کا معیارِ اخلاق بہر حال غیر مسلم قوموں سے ہمیشہ بلند رہا۔ علاوہ بریں، ہر زمانے میں ایسے لوگ بھی برابر موجود رہے، جو اسلام کی پیروی پر ثابت قدم تھے اور اسلامی علم وعمل کو اپنی زندگی میں اور اپنے محدود حلقہ اثر میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو مقصدِ اصلی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا، اس کے لیے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں۔

نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو، اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے، اور نہ یہی بات کافی تھی کہ چند افراد یہاں اور چند وہاں محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں، اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام اور جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہٰذا، دین کو ہر دور میں ایسے طاقت ور اشخاص، گروہوں اور اداروں کی ضرورت تھی اور ہے، جو زندگی کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں۔ [۴۴]

اسلام کا سیلِ رواں

اسلامی تاریخ سے متعلق مولانا مودودی کے نقطہ نظر کی مکمل تصویر پیش کرنے کے لیے ہم یہاں ان کے ایک خطبے سے کچھ عبارتیں پیش کرتے ہیں۔ یہ خطبہ اُنھوں نے اسلام عصر حاضر میں کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، جس میں رسول کریم ﷺ کی دعوت، اُمت مسلمہ کی تشکیل اور ایک مثالی اسلامی حکومت کے قیام پر گفتگو کرنے کے بعد سارے عالم میں اسلام کے پھیلنے پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ذاتی طور پر خود دعوت اسلامی میں کتنی کشش اور کتنی زبردست قوت پائی جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

ایسی ایک قوم اور ایسی ایک ریاست بن جانے کے بعد جس طرح خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے اس کے لیے تاریخ میں 'انفجار' (explosion) کا لفظ

استعمال کیا جاتا ہے، یعنی جیسے کوئی بم پھٹتا ہے اس طرح اسلام دُنیا میں پھیلنا شروع ہو گیا اور چند سال کے اندر وہ دیکھتے دیکھتے افغانستان اور ترکستان سے لے کر شمالی افریقا تک ایک سیلِ رواں کی طرح پھیلتا چلا گیا۔

یہ حیرت انگیز انفجار آخر کس چیز کا نتیجہ تھا؟ آج بھی آپ جا کر دیکھ لیجیے کہ عرب کے لوگ کتنے کچھ تنومند ہیں، یہ بھی دیکھیے کہ عرب کی سرزمین میں کتنے کچھ ذرائع و وسائل ہیں۔ تیل کا ذکر نہ کیجیے، وہ تو اب برآمد ہوا ہے۔ اسے چھوڑ کر دیکھیے کہ وہاں کیا دھرا ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ عربوں کی تعداد کتنی ہے۔ شاید اس وقت جزیرۃ العرب کی آبادی ایک

۴۴۔ تجدید و احیائے دین، ص ۳۳، ۳۴، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

کروڑ سے بھی کم ہے اور خلافت راشدہ کے زمانے میں یقیناً بہت کم ہوگی۔ ایسی ایک قوم کا اتنے بڑے رقبۂ زمین پر یوں اچانک حاوی ہو جانا، درحقیقت مادی طاقت میں برتری کا نتیجہ نہ تھا۔ اصل چیز جس نے دُنیا کو مسخر کیا وہ پوری مسلمان قوم کا اور اس کے ایک ایک مسلم فرد کا وہ رویہ تھا، جو صلح اور جنگ اور مفتوح علاقوں کے نظم و نسق اور مفتوح آبادیوں کے ساتھ برتاؤ میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایران اور روم کی سلطنتوں کے ماتحت جو لوگ رہتے تھے، اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے کیا معنی، کبھی اپنے تصور میں بھی وہ گورنر نہ دیکھے تھے جو سڑکوں پر پیدل چلیں، عام آبادیوں میں عام انسانوں کی طرح رہیں، ہر وقت اپنے دروازے ان لوگوں کے لیے کھلے رکھیں، جنھیں کسی مدد کی ضرورت ہو، اور جس آدمی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے وہ ان کا دامن پکڑ کر کہہ سکے کہ: 'مجھے یہ شکایت ہے اس کو رفع کیجیے۔'

اُنھوں نے کبھی خواب میں بھی ایسے گورنر نہ دیکھے تھے اور نہ وہ سوچ سکتے تھے کہ دُنیا میں ایسے بھی گورنر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب اس مسلم معاشرے نے ان ممالک میں داخل ہو کر ایسے گورنر لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیے، تو آخر کتنے لوگ ایسے ہو سکتے تھے جو

اندھے تعصب میں مبتلا ہو کر اس اخلاقی برتری کو تسلیم نہ کرتے؟

ان کی فوجوں نے دُنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کیا کہ ایک مفتوح شہر میں وہ داخل ہوتی ہیں، دونوں طرف بالاخانوں پر بنی ٹھنی عورتیں ان کے گزرنے کا تماشا دیکھنے کھڑی ہیں، مگر ایک سپاہی بھی آنکھ اٹھا کر کسی بالاخانے کی طرف نہیں دیکھتا۔ پوری فوج گزر جاتی ہے اور اس کو پتہ نہیں چلتا کہ اوپر عورتیں کھڑی ہیں۔ یہ مفتوح لوگ صدیوں سے جو کچھ دیکھتے چلے آرہے تھے اور ان کے باپ دادا نے جو قصے ان کو سنائے تھے، وہ تو یہ تھے کہ جب کوئی فاتح فوج کسی بستی میں داخل ہوتی ہے تو اس کی ایک عورت کا بھی دامنِ عصمت تار تار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ فوج ان لوگوں کے دل نہ جیت لیتی جو علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہے، مگر کہیں کسی کی عزت و آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔ ان نئے فاتحوں نے اخلاق کا یہ نرالا کرشمہ بھی دکھایا کہ اگر دشمن کے دباؤ سے کبھی کوئی جیتا ہوا علاقہ انھیں چھوڑنا پڑ گیا، تو نظم و نسق کے لیے عوام سے جو ٹیکس انھوں نے وصول کیے تھے، وہ سب یہ کہہ کر انھیں واپس کر دیے کہ یہ ٹیکس ہم نے تمھاری حفاظت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وصول کیے تھے، اب چونکہ ہم اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے اس لیے تمھارا روپیہ واپس کرتے ہیں۔ لوگ اس وقت تک جن حکمرانوں سے واقف تھے، ان کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کبھی کوئی علاقہ چھوڑنا پڑ جاتا تھا، تو لیا ہوا روپیہ واپس کرنا تو درکنار، جو کچھ لوگوں کے پاس ہوتا تھا وہ بھی لوٹ کر چلتے بنتے تھے۔ یہ اولیاء اور انبیاء کا سا اخلاق کسی حاکم گروہ میں دیکھنے کی کسی کو توقع نہ تھی کہ وہ سیاست اور ملک داری میں اس امانت اور دیانت سے کام لے گا۔

یہ تھی وہ اصل طاقت جس سے ابتدائی دور کے مسلمانوں نے دُنیا کے ایک بڑے حصّے کو مسخر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواروں نے جتنا کام کیا، اس سے کہیں زیادہ کام ان کے اخلاق و کردار نے کیا۔ چونکہ ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ اسلام کو سمجھ کر ایمان

لایا تھا اور سمجھنے کے بعد پھر اس کے مطابق اس نے اپنی سیرت بنالی تھی، اس لیے جس حیثیت میں بھی انھوں نے کام کیا، اس میں اسلام کی صحیح نمائندگی کی، اور اس کی وجہ سے دُنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکی۔ ان کی تلوار کی کاٹ سے پہلے ان کے اخلاق کی کاٹ لوگوں کے دلوں کے اندر اُتر چکی ہوتی تھی۔

اسی وجہ سے جو علاقے انھوں نے فتح کیے، وہاں کی آبادی ان کی سیاسی غلام نہیں بنی بلکہ ان کی مرید اور معتقد بن گئی۔ اس نے ان کا مذہب اختیار کرلیا۔ ان کی تہذیب قبول کرلی، حتیٰ کہ ان کی زبان بھی قبول کرلی۔ آج وہ مفتوح آبادی اپنے ان فاتحوں کو اپنا ہیرو اور اپنا مقتدا مانتی ہے۔ اور اپنی ہی قوم کے کافر اسلاف کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کیا دُنیا میں کبھی تلوار بھی یہ کرشمہ دکھا سکتی ہے؟

یہ ہماری تاریخ کا پہلا مرحلہ تھا۔ میرے پیش نظر اس وقت اس کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے، اپنے موضوع کے لحاظ سے دراصل جو بات میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس مرحلۂ آغاز میں اسلام کو دُنیا کے بڑے حصّے پر جو زبردست غلبہ حاصل ہوا تھا، وہ صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک پوری قوم نے بحیثیت مجموعی اس کو شعور اور اخلاص کے ساتھ اپنا لیا تھا۔ اس کے افراد کی سیرتوں میں اور اس کے اجتماعی کردار میں اسلام کا ٹھیک ٹھیک عملی مظاہرہ ہونے لگا تھا۔ اور ایک ایسی ریاست وجود میں آگئی تھی جو خدا کا کلمہ بلند کرنے کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنے تمام ذرائع و وسائل اس پر لگا دینے کے لیے تیار تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اسلام کو ابتداء ہی میں وہ پرزور حرکت (momentum) ملی، جس کے اثرات ۱۳ سو برس گزر جانے پر بھی آج تک چل رہے ہیں۔ اس گئی گزری حالت میں بھی آپ دیکھ لیں، آج بھی مسلمان قوم پر تاریخ کے اس ابتدائی مرحلے کا ٹھپہ موجود ہے۔ ایک مسلمان خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو اور کتنے ہی اس کے اخلاق خراب ہو چکے ہوں، مگر جب بھی آپ اس کو ٹٹول کر دیکھیں گے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے سامنے اگر کوئی

مطمح نظر ہے، تو وہی سوسائٹی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں تھی۔ اس مطمح نظر کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ گویا ایک آفتاب ہے جو ہر وقت اس کے سامنے چمک رہا ہے اور وہ اسے نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

ہر مسلمان آج بھی اسی مثالی دور کو اپنے لیے نمونہ سمجھتا ہے، اسی کا گرویدہ ہے اور اسی کو پھر ایک دفعہ دیکھنے کی تمنا دل میں لیے ہوئے ہے۔ خلافت راشدہؓ کے بعد سے آج تک دُنیا میں اسلام برابر پھیلتا چلا گیا ہے اور روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں وہ نہ پہنچا ہو۔ اس کی یہ ساری توسیع اس کے باوجود ہوتی رہی ہے کہ ہمارے اندر عیاش امراء بھی موجود رہے۔ ہم میں ظالم حکمراں بھی موجود رہے اور ہماری قوم میں بدکردار لوگوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔ ایک مدت دراز سے ہم کوئی مثالی قوم نہیں ہیں۔ جس کی کشش دُنیا کو اپنی طرف کھینچے۔ اس کے باوجود اسلام دُنیا میں پھیلتا رہا ہے اور آج بھی پھیل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ دراصل لوگ یہ سمجھتے ہوئے اسلام کو قبول کر رہے ہیں کہ اصل اسلام وہ ہے جس کا نمونہ محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفاء و اصحاب نے پیش کیا تھا، اسی کو لوگ حق سمجھتے ہیں اور اسی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

پھر مسلمانوں میں آج تک خیال اور عمل اور سیرت و اخلاق کی جو بھلائی بھی پائی جاتی ہے، وہ سب اسی ابتدائی دور کے باقی ماندہ اثرات ہیں، جو تیرہ صدیوں کے بعد بھی اپنا کام کیے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تاریخ کا وہ مرحلہ ایسا نہ تھا کہ اس کا ٹھپہ بالکل ضائع ہو چکا ہو اور اس کے اثرات ختم ہو چکے ہوں۔ نہیں آج بھی اسلام کے اندر جو حرکت پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری اسی تحریک کے نتیجہ میں پائی جاتی ہے۔[۴۵]

امام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ عبارت پڑھیے، اور اس پر غور کیجیے: 'خلافت راشدہ کے بعد سے آج تک دُنیا میں اسلام برابر پھیلتا چلا گیا ہے اور روئے زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا،

جس میں وہ نہ پہنچا ہو!'

مولانا مودودی اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ ہماری اسلامی تاریخ کے ابتدائی مرحلے میں زندگی کا وہ تلاطم تھا اور اس میں وہ توانائی اور قوت تاثیر پائی جاتی تھی، کہ تاریخ سے اس کے اثرات اور اس کے نشانات کو مٹا دینا محال ہے۔

اسی طرح مولانا مودودی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ آج اسلامی تحریک کے کام میں جو حرکت اور زندگی پائی جاتی ہے، وہ اسی مثالی تحریک کا نتیجہ ہے جو اسلام نے اپنے ابتدائی مراحل میں قائم کی تھی۔

۴۵۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اسلام عصر حاضر میں، ص ۱۱۔۱۵، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، نومبر ۲۰۱۴ء

اس طرح وہ احمد، ترمذی اور ابن حبان وغیرہ کی اس روایت کی پرزور تائید کرتے ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''میری اُمت کی مثال اس بارش کی سی ہے، جس کے بارے میں نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا ابتدائی حصّہ زیادہ بہتر ہے یا آخری حصّہ''۔[۴۶]

ملوکیت کے ادوار میں صالح بادشاہتیں

اگرچہ مولانا مودودی، ملوکیت کے دور پر سخت تنقید کرتے ہیں کہ اس دور میں اسلامی نظام کے اندر بڑی تبدیلیاں واقع ہوگئیں، اس دور کے مسلمانوں میں اعلیٰ اسلامی نمونے بہت کم ہوگئے، اسلامی دعوت کے کام سے غفلت ہوگئی، اسلامی حکومت ایک رہنما حکومت کے بجائے ٹیکس وصول کرنے والی حکومت بن گئی۔ حالانکہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ: ''اللہ نے اپنی رسول کو ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا تھا، ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا''۔[۴۷]

اس تنقید کے باوجود مولانا مودودی اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں صالح اور متقی بادشاہوں کی کثرت تھی، وہ فرماتے ہیں:

بلاشبہہ ہمارا دورِ ملوکیت بھی دُنیا کی دوسری قوموں کے ادوارِ ملوکیت سے بہت بہتر رہا ہے۔ گو ملوکیت اپنے جلو میں بہت سی خرابیاں لائی۔ لیکن پھر بھی ہماری تاریخ میں وہ تاریک دور کہیں نظر نہیں آتا جو دوسری اقوام کی تاریخ میں سب سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ میں اس بات کی داد دیتا ہوں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں اتنے صالح بادشاہ گزرے ہیں کہ دُنیا کی کسی اور قوم نے اتنے صالح بادشاہ پیدا نہیں کیے۔[۴۸]

۴۶۔ انس بن مالک کی یہ روایت امام احمد (۱۲۳۲۷) نے مسند میں نقل کی ہے اور اس کی تخریج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ اپنے شواہد اور طرق روایات کے اعتبار سے مضبوط حدیث ہے۔ ترمذی نے کتاب الامثال (۲۸۶۹) میں اس کی روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے، ناصر الدین البانی نے سلسلہ صحیحہ (۲۲۸۶) میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۴۷۔ طبقات ابن سعد: ۵/ ۳۸۴

۴۸۔ اسلام عصر حاضر میں، ص ۱۸، ایضاً۔

اگرچہ وہ اس بات پر شدید دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ جس پیمانے پر دعوت دین اور اشاعت اسلام کا کام انھیں کرنا تھا، انھوں نے نہیں کیا، اور یہ معاملہ کسی ایک بادشاہ کا نہیں بلکہ پوری اسلامی تاریخ میں یہی دیکھنے کو ملتا ہے، ضروری ہے کہ اس پر الگ سے مستقل طور سے گفتگو کی جائے۔

مسئلہ حاکمیت پر ہونے والے معرکے

مولانا مودودی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ: وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے 'حاکمیت الٰہ' کا نعرہ لگایا، اور پورے شدومد سے یہ نظریہ پیش کیا۔ اور انھی سے یہ نظریہ اور یہ نعرہ سید قطب شہیدؒ نے لیا۔ یہ معترضین فتنۂ تکفیر اور اس کی علم بردار جماعتوں کی ساری ذمہ داری اسی نظریے پر ڈالتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ: 'زمانۂ قدیم میں خوارج کا نعرہ بھی یہی تھا: **لاحکم الا للہ!**'

یہ صحیح ہے کہ مسئلہ حاکمیت پر مولانا مودودی نے بہت زور دیا ہے، حتیٰ کہ یہ ان کی فکر کا مرکزی محور کہا جا سکتا ہے، جس کے گرد اُن کے بہت سے افکار و نظریات گھومتے ہیں۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ حاکمیت کا یہ نظریہ فی نفسہٖ اسلامی ہے، صحیح ہے، اسلامی اصولوں کے مطابق ہے اور صدیوں سے اصول فقہ کے ماہرین اسے مانتے آ رہے ہیں۔

ابوحامد الغزالی جیسے بلند پایہ امام اپنی مشہور کتاب 'المستصفی من علم الأصول' کے مقدمے میں 'الحکم' کے عنوان سے جو علم اصول کے اوّلین مباحث میں سے ہے، لکھتے ہیں:

> اس سے مراد ہوتا ہے شرع کا خطاب، شرع کے آنے سے پہلے کوئی حکم نہیں ہوتا۔ اور اس کا تعلق ہوتا ہے حاکم سے، اور وہ ہے شارع۔ نیز اس کا تعلق ہوتا ہے محکوم علیہ سے، اور وہ ہے مکلف یعنی انسان، اور اس کا تعلق ہوتا ہے محکوم فیہ سے، اور وہ ہوتا ہے مکلف یعنی انسان کا عمل۔
>
> حکم پر غور و تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حکم دینے کا حق اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں۔ حکم دینے کا حق رسول کو بھی نہیں، آقا کا بھی یہ حق نہیں کہ وہ اپنے غلام کو حکم دے، نہ کسی مخلوق کا حق ہے کہ وہ کسی مخلوق کو حکم دے، اس کے برعکس سب اللہ کا حکم اور اللہ کا قانون ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو حکم دینے کا حق نہیں۔ [۴۹]

آگے پھر ''حاکم'' کے تعلق سے امام غزالی لکھتے ہیں، اور ''حاکم'' سے مراد وہ ذات ہے، جس کی طرف سے مکلفین کے نام احکام صادر ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> رہی یہ بات کہ حکم کا نفاذ کس کا حق ہے؟ تو یہ اسی کا حق ہے جو پیدا کرنے والا، اور تمام اختیارات کا مالک ہے، مملوک پر نافذ ہونے والی چیز بس مالک کا حکم ہے۔ اور مالک وہی ہوسکتا ہے جو خالق ہے۔ لہٰذا، حکم چلانا اور فیصلے کرنا اس کے علاوہ کسی اور کا حق نہیں!
>
> رہی بات نبی کی، بادشاہ کی، باپ اور شوہر کی، تو اگر وہ کسی بات کا حکم دیں اور اسے واجب قرار دیں تو کوئی چیز بھی ان کے واجب کرنے سے واجب نہیں ہوگی، بلکہ اس وجہ سے واجب ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔
>
> اگر ایسا نہ ہوتا تو جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو کوئی حکم دیتا، وہ دوسرا شخص اس کا وہ

حکم ٹھکرا دیتا، کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی کسی سے بڑھ کر نہیں ہے، نہ کوئی کسی سے کم تر ہے، اس طرح دیکھا جائے تو اطاعت صرف اللہ کی واجب ہے، اور ان لوگوں کی واجب ہے جن کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔[50]

حاکمیت الٰہ کا مسئلہ اسلام میں ایک طے شدہ اور متفق علیہ مسئلہ ہے، مخلوق پر حاکمیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں، یہ عقیدہ توحید کا بنیادی ستون ہے جسے قرآن نے طے کر دیا ہے،

۴۹۔ المستصفی لأبی حامد الغزالی: ۱/۸، طبعۃ دار صادر، بیروت

۵۰۔ الالمستصفی لأبی حامد الغزالی: ۱/ ۸۳، اور فواتح الرحموت نامی کتاب (۱/ ۲۵) میں ہے: اُمت کا اجماع ہے اس بات پر کہ حکم دینا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، بعض مشائخ کے یہاں ملتا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے یعنی ماتریدیہ کے نزدیک۔ اور معتزلہ کے یہاں حاکم عقل ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے، یہ کہنے کی جرأت کبھی ایک مسلمان نہیں کرسکتا۔ معتزلہ تو یہ کہتے ہیں کہ ''عقل بعض احکام الٰہی کی نشاندہی کرتی ہے، چاہے وہ شریعت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوں یا نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے یعنی ماتریدیہ کے بعض بڑے مشائخ سے بھی منقول ہے۔

خاص طور سے سورۃ الانعام میں اس کی تفصیل موجود ہے، توحید کے تین بنیادی عناصر ہیں:

۱۔ اللہ کے علاوہ کسی کو ولی نہ بنایا جائے:

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الانعام ۶: ۱۴)

کہو: اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔

۲۔ اللہ کے علاوہ کسی کو حَکَم نہ بنایا جائے:

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (الانعام ۶: ۱۱۴)

پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمھاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟

۳۔ اللہ کے علاوہ کسی کو رب نہ مانا جائے:

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ ھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (الانعام ۶: ۱۶۴)

کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور ربّ تلاش کروں، حالانکہ وہی ہر چیز کا ربّ ہے؟

ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکمیت اسی کے لیے خاص ہے، کوئی اور اس میں اس کا شریک نہیں، مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ ہوں:

۴۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ (الانعام ۶:۵۷)

فیصلے کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امر حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

۵۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (یوسف ۱۲:۴۰)

فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔

۶۔ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (الرعد ۱۳:۴۱)

اللہ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں۔

۷۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (الکہف ۱۸:۲۶)

اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

۸۔ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص ۲۸:۷۰)

اور حاکمیت اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔

۹۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (المومن ۴۰:۱۲)

اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔

اگرچہ آخری آیات میں اس بات کا احتمال ہے کہ حکم سے مراد حکم کونی ہو، یعنی کائنات میں مطلق تصرف اسی کا ہے، اس طور سے کہ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے: ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں حکم سے 'حکم تشریعی' مراد نہیں ہوگا، اور لفظ 'حاکمیت' سے 'حکم تشریعی' ہی مراد ہوتا ہے۔

بہرکیف، 'حاکمیت' سے مراد اگر ایسی قانون ساز طاقت ہو، جو سب سے بلند و بالا ہو، اور غیر محدود اختیارات کی مالک ہو، جو حکم دینے اور روکنے، اجازت دینے اور منع کرنے، حلال کرنے اور حرام کرنے، اور لازم کرنے اور فرض قرار دینے کے جملہ اختیارات رکھتی ہے، تو اس میں شک نہیں کہ یہ 'حاکمیت' صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے، صرف اسی کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جس چیز کا چاہے پابند بنائے اور جس چیز سے چاہے انھیں بری کردے۔

لیکن اگر اس 'حاکمیت' سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کو قانون سازی سے مطلقاً روک دیا جائے، اور ہر انسانی حاکمیت کو ٹھکرا دیا جائے، اگرچہ وہ کچھ پابندیوں کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ زمانۂ قدیم میں سادہ لوح خوارج نے کیا، مسلمانوں میں باہم شدید اختلاف ہوا، تو فیصلے کے لیے اُنھوں نے کسی کو حکم بنانے کو قبول نہیں کیا، اور کہا: فیصلہ کرنے کا حق اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں! **لاحکم الاللہ**۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا کہ اُنھوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو حَکَم بنایا ہے۔ اگر 'حاکمیت' سے مراد یہی ہے، جیسا کہ کبھی کبھی علامہ مودودی کی عبارتوں سے اس قسم کا گمان ہوتا ہے تو یہ قابلِ قبول نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے خوارج کی یہ بات سختی سے ٹھکرا دی تھی، اور انھیں خود قرآن مجید کے دلائل سے لاجواب کر دیا۔

جب زوجین کے درمیان رشتہ ٹوٹ جانے یا پھوٹ پڑ جانے کا اندیشہ ہو، تو قرآن مجید نے ان دونوں کے تعلقات کو بہتر بنانے اور ان کے درمیان صلح کرانے کے لیے انسانوں میں سے حَکَم بنانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسی طرح اگر حالتِ احرام میں کوئی شخص کوئی شکار ماردے تو اس صورت میں بھی اس کا فدیہ متعین کرنے کے لیے انسانوں میں سے حَکَم بنانے کی بات کہی گئی ہے: **يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ** (المائدۃ۵:۹۵) وہ فیصلہ کرتے ہیں دو

آدمیوں کے ساتھ جوتم میں سے ہوں۔

انصاف پسند قاری کا یہ فرض ہے کہ وہ مولانا مودودی کی تحریروں کو آپس میں ملا کر دیکھے، اور کسی ایک تحریر پر یا کسی ایک زمانے کی گفتگو پر اکتفانہ کر بیٹھے، کیونکہ بہت سی کتابیں انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے لکھی ہیں، جبکہ پاکستان کی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور مولانا بھی ابھی پختگی کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔

اس وقت علامہ مودودی کی ابھرتی ہوئی جوانی تھی، جو کہ جذبات کی شدت کا زمانہ ہوتا ہے۔ تجدید و احیائے دین ۱۹۴۰ء کی تحریر ہے، جو مولانا کے جوش شباب کا زمانہ تھا۔ یہ ایک طویل مقالہ تھا، جو ماہ نامہ 'الفرقان' کے خصوصی شمارہ 'شاہ ولی اللہ دہلوی نمبر' میں شائع ہوا تھا۔

قانون سازی کا دائرہ

دیکھیے، مولانا مودودی نے کتنی صراحت کے ساتھ اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں لکھا ہے کہ قانون سازی میں اُمت کا کیا رول رہا ہے؟ 'حاکمیت' اور اس کا مفہوم بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> بادی النظر میں ایک آدمی ان بنیادی حقیقتوں کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس صورت میں تو ایک اسلامی ریاست میں اسلامی قانون سازی کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں تو قانون ساز صرف خدا ہے، اور مسلمانوں کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس پیغمبر کے دیئے ہوئے قانون خداوندی کی پیروی کریں۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام قانون سازی کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اسے خدائی قانون کی بالاتری سے محدود کرتا ہے۔ اس بالاتر قانون کے تحت، اور اس کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر، انسانی قانون سازی کا دائرۂ عمل کیا ہے، اس کو میں یہاں مختصر الفاظ میں بیان کروں گا:

○ تعبیر احکام: انسانی زندگی کے معاملات میں سے ایک قسم کے معاملات وہ

ہیں جن میں قرآن اور سنت نے کوئی واضح اور قطعی حکم دیا ہے، یا کوئی خاص قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کوئی فقیہ، کوئی قاضی، کوئی قانون ساز ادارہ، شریعت کے دیے ہوئے حکم یا اس کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کو نہیں بدل سکتا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں قانون سازی کے لیے کوئی مجال کار ہے ہی نہیں۔ انسانی قانون سازی کا دائرہ عمل ان معاملات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جائے کہ حکم فی الواقع ہے کیا، پھر اس کا منسأ اور مفہوم متعین کیا جائے اور یہ تحقیق کی جائے کہ یہ حکم کن حالات اور واقعات کے لیے ہے۔ پھر عملاً پیش آنے والے مسائل پر ان کے انطباق کی صورتیں اور مجمل احکام کی جزئی تفصیلات طے کی جائیں، اور ان سب امور کے ساتھ یہ بھی مشخص کیا جائے کہ استثنائی حالات وواقعات میں ان احکام وقواعد سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش کہاں اور کس حد تک ہے۔

○ **قیاس:** دوسری قسم کے معاملات وہ ہیں جن کے بارے میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے، مگر ان سے ملتے جلتے معاملات کے متعلق وہ ایک حکم دیتی ہے، اس دائرے میں قانون سازی کا عمل اس طرح ہوگا کہ احکام کی علتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ان تمام معاملات میں ان کو جاری کیا جائے گا جن میں وہ علتیں فی الواقع پائی جاتی ہوں، اور ان تمام معاملات کو ان سے مستثنیٰ ٹھیرایا جائے گا، جن میں درحقیقت وہ علتیں نہ پائی جاتی ہوں۔

○ **استنباط:** ایک اور قسم ان معاملات کی ہے جن میں شریعت نے متعین احکام نہیں بلکہ کچھ جامع اصول دیئے ہیں۔ یا شارع کا یہ منسأ ظاہر کیا ہے کہ کیا چیز پسندیدہ ہے جسے فروغ دینا مطلوب ہے، اور کیا چیز ناپسندیدہ ہے جسے مٹانا مطلوب ہے۔ ایسے معاملات میں قانون سازی کا کام یہ ہے کہ شریعت کے ان اصولوں کو اور شارع کے اس منسأ کو سمجھا جائے، اور عملی مسائل میں ایسے قوانین بنائے جائیں جو ان اصولوں

پر مبنی ہوں اور شارع کے منشا کو پورا کرتے ہوں۔

○ **آزادانہ قانون سازی کا دائرہ:** ان کے علاوہ ایک بہت بڑی قسم ان معاملات کی ہے جن کے بارے میں شریعت بالکل خاموش ہے، نہ براہ راست ان کے متعلق کوئی حکم دیتی ہے اور نہ ان سے ملتے جلتے معاملات ہی کے متعلق کوئی ہدایت اس میں ملتی ہے کہ ان کو اس پر قیاس کیا جا سکے۔ یہ خاموشی خود اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم اعلیٰ ان میں انسان کو خود اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق دے رہا ہے۔ اس لیے ان میں آزادانہ قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ قانون سازی ایسی ہونی چاہیے جو اسلام کی روح اور اس کے اصول عامہ سے مطابقت رکھتی ہو، جس کا مزاج اسلام کے مجموعی مزاج سے مختلف نہ ہو، جو اسلامی زندگی کے نظام میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو سکتی ہو۔

○ **اجتہاد:** قانون سازی کا یہ سارا عمل، جو اسلام کے قانونی نظام کو متحرک بناتا اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کو نشوونما دیتا چلا جاتا ہے، ایک خالص علمی تحقیق اور عقلی کاوش ہی کے ذریعے سے انجام پا سکتا ہے، اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں 'اجتہاد' ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی تو ہیں ''کسی کام کی انجام دہی میں انتہائی کوشش صرف کرنا''۔

مگر اصطلاحاً اس سے مراد ہے ''یہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کہ ایک مسئلہ زیر بحث میں اسلام کا حکم یا اس کا منشا کیا ہے''۔

بعض لوگ غلطی سے 'اجتہاد' کو بالکل آزادانہ استعمال رائے کے معنی میں لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص جو اسلامی قانون کی نوعیت سے واقف ہے، اس غلط فہمی میں نہیں پڑسکتا کہ اس طرح کے ایک قانونی نظام میں کسی آزاد اجتہاد کی بھی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے، یہاں تو اصل قانون قرآن وسنت ہے۔

انسان جو قانون سازی کر سکتے ہیں وہ لازماً یا تو اس اصل قانون سے ماخوذ ہونی چاہیے،

یا پھر ان حدود کے اندر ہونی چاہیے، جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دیتا ہے۔ اس سے بے نیاز ہوکر جو اجتہاد کیا جائے، وہ نہ اسلامی اجتہاد ہے اور نہ اسلام کے قانونی نظام میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے۔[51]

آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھے بغیر من مانی تاویلات سے جو 'اجتہاد' کیا جائے، اُسے اگر سیاسی قوت کے بل پر قانون کا مرتبہ دے بھی دیا جائے تو نہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس کو قبول کرسکتا ہے اور نہ وہ حقیقتاً اسلامی نظام قانون کا جزو بن سکتا ہے۔ جو سیاسی قوت اسے نافذ کرے گی، اس کے ہٹتے ہی اس کا قانون بھی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے گا۔ [52]

اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟

آگے مولانا مودودی ایک اہم مسئلے کو زیر بحث لاتے ہیں کہ فقہی اجتہادات قانون کیسے بن جاتے ہیں؟ یا انھیں قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

کسی اجتہاد کو قانون کا مرتبہ حاصل ہونے کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں

۵۱۔ اسلامی ریاست، ص ۴۴۱۔ ۴۴۳، ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء
۵۲۔ ایضاً، ص ۴۴۶

پائی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام اُمت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔

دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس کی پیروی شروع کردیں، جس طرح مثلاً فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے قانون کے طور پر مان لیا۔

تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے، جیسے عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔

چوتھی یہ کہ ریاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے۔

ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں، ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں ہے۔

رہے قاضیوں کے فیصلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کیے ہوں، اور انھیں نظائر (precedents) کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے۔

حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے بھی وہ فیصلے اسلام میں قانون نہیں قرار پائے جو اُنھوں نے قاضی کی حیثیت سے کیے تھے۔ اسلامی نظام قانون میں قضاۃ کے بنائے ہوئے قانون (judge made law) کا تصور نہیں پایا جاتا۔ [۵۳]

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ہمارا خیال ہے کہ مولانا مودودی کا 'نظریہ حاکمیت' وہی ہے جو ہمارا ہے۔ وہ عقلِ مسلم کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اجتہاد کے ذریعہ اُمت

۵۳۔ اسلامی ریاست، ص:۴۴۶، ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء

کے لیے تشریع اور قانون سازی میں اپنا کردار ادا کرے۔ وہ اجتہاد جس کا دروازہ اس کی اہلیت رکھنے والے افراد کے لیے کھلا ہوا ہے، جہاں اس کا موقع ہو، وہ بے تکلف اجتہاد کر سکتے ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ تو ان مبہم جو لوگوں کے لیے بند ہوتا ہے، جو اس کے اہل نہیں ہوتے یا جو اجتہاد کے متعین دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں، اور ان امور میں اجتہاد کرنے لگ جاتے ہیں جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ناقابل تغیر قطعی حقائق ہوتے ہیں، جن کے

سلسلے میں محکم نصوص موجود ہوتے ہیں۔

امام ابوالاعلیٰ مودودی نے ان مختصر الفاظ میں اسلام میں قانون سازی کے اصول بیان کیے ہیں:

> عبادات میں صرف وہی عمل کرو جو بتا دیا گیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نیا طریقۂ عبادت ایجاد نہ کرو، اور معاملات میں جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کے پابند رہو، جس چیز سے روک دیا گیا ہے اس سے رُک جاؤ اور جس چیز کے بارے میں شارع (اللہ اور اس کے رسول ﷺ) نے سکوت اختیار کیا ہے اس میں تم اپنی صواب دید کے مطابق کرنے کے لیے آزاد ہو۔[۵۴]

❖❖❖

۵۴۔ ایضاً، ص: ۴۵۴